حقوق الزوجین

سید ابوالاعلیٰ مودودی

حقوق الزوجین

جس میں اسلامی قانونِ ازدواج کے مقاصد، نکاح و طلاق کے مسائل اور یورپ کے قوانین طلاق و فسخ و تفریق پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ ـــــ لاہور

طابع: حسین فاروق مودودی

ناشر: ادارہ ترجمان القرآن
اچھرہ۔ لاہور

مطبع: ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ۔ لاہور

اشاعت:

پہلی تا گیارھویں	۱۹۴۳ تا ۱۹۶۶ء	۱۶۵۰۰
بارھویں	نومبر ۱۹۶۹ء	۲۰۰۰
تیرھویں	جون ۱۹۷۱ء	۱۰۰۰
چودھویں	نومبر ۱۹۷۲ء	۱۰۰۰
پندرھویں	جون ۱۹۷۴ء	۳۰۰۰
سولہویں	مارچ ۱۹۷۶ء	۵۰۰۰
سترھویں	جولائی ۱۹۷۹ء	۲۵۰۰
اٹھارھویں	اگست ۱۹۸۱ء	۲،۰۰۰
انیسویں	نومبر ۱۹۸۲ء	۲،۰۰۰

قیمت ۱۲/- روپے

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ طبع اوّل

۳۴-۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ حیدرآباد دکن، بھوپال اور برطانوی ہند میں یہ مسئلہ بہت زور شور کے ساتھ اٹھا تھا کہ مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو خرابیاں رائج الوقت قانون کے نقائص کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہیں، اُن کو دُور کرنے اور شرعِ اسلامی کے احکام کو صحیح طور پر نافذ کرنے کے لیے کوئی نتیجہ خیز سعی ہونی چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت سے مسوداتِ قانون ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مرتب کیے گئے اور کئی سال تک ان کی بازگشت سنی جاتی رہی۔ اس زمانے میں مجھے محسوس ہوا کہ اس مسئلے کے بہت سے پہلو اور نہایت اہم پہلو ایسے ہیں جن پر کما حقہ توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ چنانچہ میں نے سنہ ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۵ء) میں حقوق الزوجین کے عنوان سے ایک طویل سلسلہ مضامین "ترجمان القرآن" میں لکھا اور اس میں اسلام کے قانون ازدواج کی روح اور اس کے اصول کی وضاحت کرنے کے ساتھ اُن احکام کی تشریح کی جو معاملاتِ زن و شوہر کی اصلاح کے لیے ہم کو قرآن و حدیث میں ملتے ہیں اور چند ایسی تجاویز پیش کیں جن سے مسلمانوں کی موجودہ قانونی مشکلات صحیح طریقہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ یہ سلسلہ اصل میں تو علماء کرام کی توجہ منعطف کرانے کے لیے لکھا گیا تھا مگر اس میں بہت سے ایسے مباحث بھی آگئے تھے جن کا مطالعہ عام ناظرین کے لیے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جن لوگوں نے

میری کتاب "پردہ" ملاحظہ فرمائی ہے وہ خود بخود اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے کہ تعلقات زن و مرد کو منضبط کرنے کے لیے اسلام نے جو قوانین مقرر کیے ہیں اُن سے واقفیت حاصل کریں۔ تاکہ اس دین کا پورا نظامِ معاشرت ان کی سمجھ میں آسکے۔ اسی ضرورت کو محسوس کر کے اب اس سلسلۂ مضامین کو بعض ضروری اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ابو الاعلیٰ

۲۸ صفر ۶۲ ۱۳ھ (۵ مارچ ۱۹۴۳ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع چہارم

سترہ سال ہوئے کہ یہ کتاب ایک مسلسل مضمون کی شکل میں شائع کی گئی تھی اور دس سال سے یہ کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے۔ اگرچہ اوّل روز ہی اس میں یہ تصریح کر دی گئی تھی کہ فقہ حنفی کے ازدواجی ضابطے میں جو اصلاحات اس کے اندر تجویز کی گئی ہیں، ان کی حیثیت فتوے کی نہیں بلکہ تجاویز کی ہے جو علماء کے سامنے اس غرض کے لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ اگر وہ ان کو شرعی اور عقلی دلائل کے لحاظ سے درست پائیں تو ان کے مطابق فتوے بھی تبدیل کر دیں؛ لیکن اس کے باوجود اس کی اشاعت کے پہلے روز سے آج تک نہ تو اس کی تجاویز پر سنجیدہ غور کیا گیا اور نہ کسی نے علمی تنقید کی تکلیف اٹھائی۔ البتہ اسے میرے خلاف فتنہ برپا کرنے کا ذریعہ پہلے بھی بنایا گیا تھا اور اب بھی بنایا جا رہا ہے۔ فالیٰ اللہ المشتکیٰ

اب نظرِ ثانی کے موقع پر بہت سی جزئی اصلاحات کے ساتھ میں نے اس کی دو بحثوں کو نسبتہً زیادہ مدلّل کر دیا ہے جن کے دلائل پہلے زیادہ قوت کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے تھے۔ ایک ایلاء کی بحث، دوسرے ولایتِ اجبار کی بحث۔ باقی کسی چیز میں مخالفین کی طعنہ زنیوں کے باوجود میں نے کسی تغیر کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ابو الاعلیٰ   ۷ رمضان ۱۳۷۱ھ (۱۱ جون ۵۲ء)

مُقدّمہ

ہر سوسائٹی کے تمدن کی شیرازہ بندی کے لیئے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے - ایک ایسا جامع قانون جو اس کے مخصوص طرز تمدن کے مزاج کی رعایت ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہو - دوسرے ایک ایسی ہیئت حاکمہ جو اس قانون کو ٹھیک ٹھیک اُسی اسپرٹ میں نافذ کرنے والی ہو جس میں وہ وضع کیا گیا تھا - بدقسمتی سے ہندستان کے مسلمان اس وقت ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں - بلاشبہ ان کے پاس کتابوں میں لکھا ہُوا ایک قانون ضرور موجود ہے، جو اسلامی تمدن و تہذیب کے مزاج سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہے اور تمدن و معاشرت کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے - مگر یہ قانون اب عملاً منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا قانون اُن کے تمدّنی معاملات پر فرمانروائی کر رہا ہے جو تمدن و معاشرت کے اکثر و بیشتر معاملات میں کلیتہً غیر اسلامی ہے - اور اگر کسی حد تک اسلامی ہے بھی تو اد مشور ا مسلمان اس وقت جس نظامِ حکومت کے تابع ہیں اس نے عملاً ان کی تمدنی زندگی کو دو شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے - ایک شعبہ وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر بھی ایسے قوانین نافذ کر دیئے ہیں جو اسلامی تمدن کے مزاج سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتے -

دوسرا شعبہ وہ ہے جس میں اس نے اصولاً مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ ان پر اسلامی قانون نافذ کیا جائے۔ مگر عملاً اس شعبہ میں بھی شرعِ اسلامی کا نفاذ صحیح طریق پر نہیں کیا جاتا۔ "محمڈن لا" کے نام سے جس قانون کو اس شعبہ میں نافذ کیا گیا ہے وہ اپنی شکل اور روح دونوں میں اصل اسلامی شریعت سے بہت کچھ مختلف ہے اور اس کے نفاذ کو صحیح معنوں میں شرعِ اسلامی کا نفاذ نہیں کہا جا سکتا۔

اس افسوس ناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵۰ فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصّہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگِ بنیاد ہے۔ اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اُس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کے لیئے بنایا گیا ہو۔ کیونکہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصّہ میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچّہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں مؤثر ہوں گے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریکِ زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات کی بندشوں میں بندھے گی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک بہو بیٹے اور بیٹی داماد کے تعلقات کی بہتری پر منحصر ہو گا۔ غرض قانونِ ازدواج ایک ایسا قانون ہے جو قوانینِ تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام

یں اس قانون کی اسی حقیقی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر اس کی تدوین نہایت صحیح اصولوں پر کی گئی تھی اور مسلمانوں کو ازدواجی معاملات میں اپنے دین سے ایک ایسا صالح، جامع اور مکمل قانون ملا تھا جس کو دنیا کے قوانینِ ازدواج میں ہر حیثیت سے بہترین کہا جا سکتا ہے۔ مگر شومیِ قسمت سے یہ قانون بھی "محمڈن لا" کی جھپیٹ میں آگیا اور اس بُری طرح مسخ ہُوا کہ اس میں اور اصل اسلامی قانونِ ازدواج میں ایک بہت ہی دُور کی مشابہت باقی رہ گئی ہے۔ اب شریعِ اسلامی کے نام سے مسلمانوں کے ازدواجی معاملات میں جو قانون نافذ ہے وہ نہ صالح ہے، نہ جامع، نہ مکمل۔ اس کے نقائص نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی پر اتنا بُرا اثر ڈالا ہے کہ شاید کسی دوسرے قانون نے نہیں ڈالا۔ مشکل ہی سے ہندستان میں کوئی ایسا خوش قسمت خاندان مِل سکے گا جس میں اس ناقص قانون کی بدولت کوئی زندگی تباہ نہ ہُوئی ہو۔ زندگیوں کا تباہ ہونا تو پھر بھی ایک امرِ حقیر ہے۔ اس سے زیادہ بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس قانون کی خرابی نے بکثرت مسلمانوں کی عزت و ناموس کو تباہ کیا۔ ان کے اخلاق اور ایمان کو برباد کر ڈالا۔ اور جو گھر اُن کے دین اور ان کی تہذیب کے محفوظ ترین قلعے تھے، ان میں بھی فواحش اور ارتداد کے سیلاب کو پہنچا دیا۔

قانون اور اس کو نافذ کرنے والی مشین کے نقائص سے جو خرابیاں پیدا ہُوئیں اُن پر مزید خرابیوں کا اضافہ دو وجوہ سے ہُوا۔

ایک دینی تعلیم و تربیت کا فقدان، جس کی بدولت مسلمان اسلام کے قانون ازدواج سے اس حد تک بیگانہ ہو گئے کہ آج اچھے اچھے تعلیم یافتہ

آدمی اس قانون کے معمولی مسائل تک سے ناواقف ہیں[1]۔ تفصیلات تو درکنار اس کے اصول تک کو جاننے اور سمجھنے والے مسلمان بہت کم ملیں گے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کے معاملاتِ نکاح و طلاق کا تصفیہ کرتے ہیں، اسلامی قانون ازدواج کے مبادی تک سے ناواقف ہیں۔ اس عام جہالت نے مسلمانوں کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ وہ بطور خود اپنے ازدواجی تعلقات میں اسلامی قانون کا ٹھیک ٹھیک اتباع کر سکیں۔

رہی دوسری وجہ تو وہ غیر اسلامی تمدنوں کا اثر ہے جس کی بدولت مسلمانوں کے ازدواجی تعلقات میں نہ صرف بہت سے ایسے رسمیات اور رسمیات داخل ہو گئے ہیں جو اسلامی قانونِ ازدواج کے اصول اور اس کی اسپرٹ کے

---

[1] مثال کے طور پر یہ جہالت ہی کا کرشمہ ہے کہ مسلمان بالعموم طلاق دینے کے صرف ایک ہی طریقہ سے واقف ہیں اور وہ یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی جائیں۔ حتیٰ کہ طلاق کی دستاویز لکھنے والے بھی جب لکھتے ہیں، تین ہی طلاق لکھتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں یہ بدعت اور سخت گناہ ہے۔ اس سے بڑی قانونی پیچیدگیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہوتا کہ ایک طلاق دینے سے وہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے جس کے لیے تین طلاقیں دی جاتی ہیں۔ اور اس صورت میں عدت کے اندر رجوع کرنے اور عدت گزر جانے پر دوبارہ نکاح کر لینے کا موقع بھی باقی رہتا ہے، تو کتنے ہی گھر تباہ ہونے سے اور کتنے ہی بندگانِ خدا جھوٹ اور حیلہ بازیوں اور دوسری قانون شکنیوں سے بچ جاتے۔

خلاف ہیں، بلکہ سرے سے زوجیت کا اسلامی تصوّر ہی ان کی ایک بڑی اکثریت
کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ کہیں ہندو تصور غالب آگیا ہے اور اس کا اثر یہ ہے
کہ بیوی کو لونڈی اور شوہر کو آقا بلکہ دیوتا سمجھا جاتا ہے۔ نکاح کی بندش اعتقاداً
نہیں تو عملاً ناقابلِ فسخ ہے۔ طلاق اور خلع اس قدر معیوب ہو گئے ہیں کہ جہاں
ان کی ضرورت ہے وہاں بھی ان سے محض اس بنا پر احتراز کیا جاتا ہے کہ کہیں
ناک نہ کٹ جائے خواہ در پردہ وہ سب کچھ کیا جائے جو درحقیقت طلاق اور
خلع سے زیادہ بدتر ہے۔ طلاق کو روکنے کے لیے مہر کی مقدار اس قدر بڑھا
دی گئی ہے کہ شوہر کبھی طلاق دینے کی ہمت ہی نہ کر سکے، اور منافرت کی
صورت میں عورت کو معلق رکھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ "شوہر پرستی"
عورت کے مفاخر اور اخلاقی فرائض میں داخل ہو گئی ہے۔ سخت سے سخت حالات
میں بھی وہ محض سوسائٹی کی لعنت ملامت کے خوف سے طلاق یا خلع کا نام زبان
پر نہیں لا سکتی۔ حتیٰ کہ اگر شوہر مر جائے تب بھی اس کا اخلاقی فرض یہ ہو گیا ہے
کہ ہندو عورتوں کی طرح اس کے نام پر بیٹھی رہے، کیونکہ بیوہ کا نکاح ثانی ہونا نہ
صرف اُس کے لیے بلکہ اس کے سارے خاندان کے لیے موجب ذلت ہے۔
دوسری طرف جو نئی نسلیں فرنگی تہذیب سے متاثر ہوئی ہیں، اُن کا حال یہ ہے کہ
وہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ[1] تو بڑے زور سے کہتے ہیں، مگر
لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ[2] پر پہنچ کر دفعتہً ان کی آواز دب جاتی ہے اور

---

[1] عورتوں کو بھی حسنِ سلوک کا ویسا ہی حق ہے جیسا مردوں کو ان پر حاصل ہے۔

[2] مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ زیادہ حاصل ہے۔

اور جب اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ[1] کا فقرہ ان کے سامنے آتا ہے تو ان کا بس نہیں چلتا کہ کس طرح اس آیت کو قرآن سے خارج کر دیں۔ عجیب عجیب طریقہ سے اس کی تاویلیں کرتے ہیں اور تاویل کا انداز کہے دیتا ہے کہ وہ اپنے دل میں اس بات پر سخت شرمندہ ہیں کہ ان کے مذہب کی مقدس کتاب میں یہ آیت، پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ فرنگی تہذیب نے عورت اور مرد کی مساوات کا جو صور پھونکا ہے اس سے وہ دحشت زدہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کے دماغوں میں اُن ٹھوس اور مستحکم عقلی اصولوں کو سمجھنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے، جن پر اسلام نے اپنے نظامِ معاشرت کو قائم کیا ہے۔

ان مختلف اسباب نے مل جل کر مسلمانوں کی خاندانی زندگی کو اُتنا ہی بدتر کر دیا ہے جتنی وہ کسی زمانہ میں بہتر تھی۔ جہالت اور اجنبی تمدّنوں کے اثر سے ان کے ازدواجی معاملات میں جو پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کو سلجھانے سے موجودہ قانون اور اس قانون کو نافذ کرنے والی مشین سراسر قاصر ہے۔ بلکہ اس کے قصور نے ان پیچیدگیوں پر بہت سی مزید الجھنوں کا اضافہ کر دیا ہے۔

ناواقفیت کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ ان تمام خرابیوں کی وجہ اسلامی قانون کا نقص ہے۔ اسی لیے ایک نئے قانون کی تدوین پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت اسلام میں ایک ایسا مکمل ازدواجی قانون موجود ہے جس میں زوجین کے لیے انصاف کے ساتھ واضح حقوق متعین کیے گئے

---

[1] مرد عورتوں پر قوّام ہیں۔

ہیں۔ ان حقوق کی حفاظت کا اور تعدی کی صورت میں (خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے) دادرسی کا پورا انتظام کیا گیا ہے اور ایسی کوئی پیچیدگی نہیں چھوڑی گئی ہے جس کو عدل کے ساتھ حل نہ کر دیا گیا ہو۔ لہٰذا مسلمانوں کو کسی نئے قانون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصلی ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کا قانون ازدواج اپنی صحیح صورت میں پیش کیا جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے علماء کا فرض ہے کہ تقلید جامد کو چھوڑ کر موجودہ زمانے کے حالات و ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے اسلام کے قانونِ ازدواج کو ایسی صورت میں مدوّن کریں کہ مسلمانوں کے ازدواجی مسائل کی موجودہ پیچیدگیوں کو پوری طرح حل کیا جا سکے۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی جانی چاہیئے تاکہ وہ اپنے نظامِ معاشرت کو ان جاہلانہ رسموں اور اُن جاہلی تصورات سے پاک کریں جن کو انہوں نے غیر اسلامی تمدنوں سے اخذ کیا ہے اور اسلامی قانون کے اصول اور اسپرٹ کو سمجھ کر اس کے مطابق اپنے معاملات انجام دیں۔ پھر ایک ایسا نظامِ عدالت درکار ہے جو خود اس قانون پر ایمان رکھتا ہو اور جس کے منصفوں کو علمی اور اخلاقی حیثیت سے وہ تربیت دی گئی ہو جو اس قانون کو دنیا کے دوسرے قوانین کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ اس کی اپنی اسپرٹ میں نافذ کریں۔

یہ مضمون اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر لکھا جا رہا ہے۔ ہم آئندہ صفحات میں اسلامی قانونِ ازدواج کا ایک پورا خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس میں اس

قانون کے مقاصد، اصول اور احکام سب چیزیں اپنے اپنے موقع پر بیان کی جائیں گی حسب ضرورت ہم تشریح کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے فیصلوں کی نظیریں اور ائمہ سلف کی اجتہادی آراء بھی نقل کریں گے تاکہ ان سے جزئی مسائل مستنبط کرنے میں آسانی ہو۔ آخر میں چند ایسی تجویزیں پیش کی جائیں گی جن سے اصولِ شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی الجھنیں کسی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ ان الجھنوں کا اصل اور صحیح علاج صرف اسلامی حکومت اور قضائے شرعی کا قیام ہے۔ لیکن ہم محض بر سبیلِ تنزل وہ کم سے کم صورتیں بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں جن سے موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی خرابیاں نسبتاً ایک صحیح شرعی طریقے سے رفع کی جا سکتی ہیں، تاکہ جو لوگ ان مسائل کے حل کی کوشش کر رہے ہیں وہ غلط سمت میں اقدام کرنے کے بجائے ایسا طریقہ اختیار کریں جو کچھ تو شریعت کے مطابق ہو۔

قانونِ ازدواج کے مقاصد

"قانون کی تفصیلات سے پہلے مقاصدِ قانون کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کیونکہ قانون میں سب سے اہم چیز اس کا مقصد ہے۔ مقصد ہی کو پورا کرنے کے لئے اصول مقرر کیئے جاتے ہیں اور اصولوں کے ماتحت احکام دیئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص مقصد کو سمجھے بغیر احکام نافذ کرے گا تو بہت ممکن ہے کہ کسی جزئی مسئلہ میں وہ ایسا حکم نافذ کر دے جس سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص قانون کے مقصد سے واقف نہ ہو گا وہ قانون کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اس کا اتباع بھی نہ کر سکے گا۔ لہٰذا ہم پہلے اُن مقاصد کی تشریح کریں گے جن کے لیئے اسلام میں ازدواج کا قانون مقرر کیا گیا ہے۔

اخلاق و عفت کی حفاظت

اسلامی قانونِ ازدواج کا پہلا مقصد اخلاق کی حفاظت ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوعِ انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطے کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے قرآن مجید میں نکاح کو لفظِ احصان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حصن قلعہ کو کہتے ہیں اور احصان کے معنی قلعہ بندی کے ہیں۔ جو مرد نکاح

کرتا ہے وہ "مُحصِن" ہے گویا وہ ایک قلعہ تعمیر کرتا ہے اور جس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے وہ "مُحصَنَۃ" ہے۔ یعنی اس قلعہ کی حفاظت میں آگئی ہے جو نکاح کی صورت میں اس کے نفس اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ استعارہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ اسلام میں نکاح کا اولین مقصد اخلاق اور عصمت کا تحفظ ہے اور قانونِ ازدواج کا پہلا کام اُس قلعہ کو مستحکم کرنا ہے جو نکاح کی صورت میں اس گراں قدر چیز کی حفاظت کے لیے تعمیر کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ۔

(النساء۔ ۲۴)

(یہ عورتیں جو تم پر حرام کی گئی ہیں) ان کے سوا باقی سب عورتیں تم پر حلال کر دی گئیں بشرطیکہ شہوت رانی کے لیے نہیں بلکہ قیدِ نکاح میں لانے کے لیے تم اپنے اموال کے بدلے میں ان کو حاصل کرنا چاہو۔

پھر عورتوں کے لیے کہتا ہے۔

فَانْکِحُوْھُنَّ بِاِذْنِ اَھْلِھِنَّ وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ۔

(النساء۔ ۲۵)

پس تم ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اُن کے ساتھ نکاح کرو، اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کرو۔ تاکہ وہ مُحصَنات بنیں نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے بدکاری کرنے والیاں۔

دُوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ-۵)

مہر ادا کر کے قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ علانیہ یا چوری چھپے ناجائز تعلقات پیدا کرنے والے۔

ان آیات کے الفاظ اور معانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق میں احصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر دوسری غرض کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ مگر کسی دوسری غرض کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ زوجین کو نکاح کی قید میں اسی لیے مقید کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر اپنی فطری خواہشات پوری کریں۔ لیکن اگر کسی قیدِ نکاح میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو، تو بجائے اس کے کہ نکاح کی ظاہری قید کو برقرار رکھنے کے لیے اللہ کی حدود کو قربان کیا جائے، بدرجہا بہتر یہ ہے کہ اللہ کی حدود پر ایسی قیدِ نکاح کو قربان کر دیا جائے۔ اسی لیے ایلا کرنے والوں کو حکم دیا گیا کہ چار مہینہ سے زیادہ اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، اور اگر وہ چار مہینے کی مدت گزرنے پر بھی رجوع نہ کریں تو انہیں ایسی عورت کو نکاح میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس سے وہ ہم بستر نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت اپنے

داعیاتِ فطرت کو پورا کرنے کے لیے حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو گی جسے اللہ کا قانون کسی حال میں گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جو لوگ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے ہیں ان کو سختی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ یعنی ایک عورت کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری عورت گویا معلق رہ جائے۔ اس حکم کا مقصد بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ایسی حالت میں مبتلا نہ ہونے پائے جس سے وہ حدود اللہ کو توڑنے پر مجبور ہو۔ ایسی حالت میں نکاح کی ظاہری قید برقرار رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کو توڑ دیا جائے اور عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو جائے۔ پھر عورت کو خلع کا حق بھی اسی مقصد کے تحت دیا گیا ہے۔ ایک عورت کا کسی ایسے شخص کے پاس رہنا جس سے وہ خوش نہ ہو، یا جس سے اس کے نفس کو اطمینان حاصل نہ ہوتا ہو، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دینا ہے جن میں حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہے۔ اس لیے ایسی عورت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کو اس کا مال، جو مہر کی صورت میں اسے ملا تھا، یا اس سے کم زیادہ دے کر قیدِ نکاح سے رہائی حاصل کر لے۔ قانونِ اسلامی کی ان دفعات کو آگے چل کر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے گا مگر یہاں ان مثالوں کے بیان کرنے سے اس حقیقت کو واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی قانون نے اخلاق و عفت کی حفاظت کو سب چیزوں سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ اگرچہ وہ قیدِ نکاح کو حتی الامکان ہر طریقے سے مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جہاں اس قید کے برقرار رہنے سے اخلاق و عفت کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہو وہاں اس متاعِ گراں مایہ کی خاطر نکاح کی گرہ کو کھول دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلامی قانون کی

جو دفعات آئندہ بیان کی جائیں گی ان کو سمجھنے اور ان کو قانون کی اسپرٹ کے مطابق نافذ کرنے کے لئے اس نکتہ کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

مودّت و رحمت

دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی کی دونوں صنفوں کے درمیان ازدواج کا تعلق مودّت و رحمت کی بنیاد پر ہو تاکہ مناکحت سے تمدّن و تہذیب کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کو وہ اپنے اشتراکِ عمل سے بدرجۂ اتم پورا کر سکیں اور ان کو اپنی خانگی زندگی میں وہ راحت و مسرت اور سکون و آرام حاصل ہو سکے جس کا حصول انہیں تمدّن کے بالاتر مقاصد پورے کرنے کی قوت بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اس مقصد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زوجیت کا تصور ہی مودّت و رحمت ہے۔ اور زوجین بنائے ہی اس لیے گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے پاس سکون حاصل کریں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔ (الروم - ۲۱)

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا

وہی ہے جس نے تم کو تنِ واحد سے پیدا کیا اور اس کیلئے خود اسی کی جنس سے ایک جوڑا

زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (اعراف۔۱۸۹) بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

پھر ایک دوسرے پیرایہ میں زوجیت کے اس تصوّر کو یوں پیش کیا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ وہ تمہارے لیے لباس ہیں۔اور تم ان کے

لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ۔۱۸۷) لیے لباس۔

یہاں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس کہا ہے۔لباس وہ چیز ہے جو انسان کے جسم سے متّصل رہتی ہے، اور اس کی پردہ پوشی کرتی ہے اور اس کو خارجی فضا کے مضر اثرات سے بچاتی ہے۔اس لباس کے استعارہ کو زوجین کے لیے استعمال کرنے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کے درمیان مناکحت کا تعلق معنوی حیثیت سے ویسا ہی تعلق ہونا چاہیے جیسا جسم اور لباس کے درمیان ہوتا ہے۔ان کے دل اور ان کی روحیں ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہوں، وہ ایک دوسرے کی ستر پوشی کریں، اور ایک دوسرے کو اُن اثرات سے بچائیں، جو ان کی عزت اور اُن کے اخلاق پر حرف لانے والے ہوں۔یہی مقتضیٰ ہے مودّت و رحمت کا اور اسلامی نقطۂ نظر سے یہ ازدواجی تعلق کی اصلی روح ہے اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ روح نہیں ہے، تو گویا وہ ایک بے جان لاش ہے۔

اسلام میں ازدواجی تعلقات کے لیے جو قوانین مقرر کئے گئے ہیں ان سب میں اس مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔زوجین اگر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، تو صلح و آشتی، محبت اور دلی یک جہتی کے ساتھ رہیں۔ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، اور آپس کے تعلقات میں فیاضانہ برتاؤ رکھیں۔لیکن وہ اگر ایسا نہ کر سکیں تو پھر ان کی یک جائی سے جدائی بہتر ہے۔کیونکہ مودّت و رحمت کی روح نکل جانے کے بعد ازدواجی

تعلق ایک مُردہ جسم ہے جس کو اگر دفن نہ کر دیا جائے تو عفونت پیدا ہو گی، اور اس سے خانگی زندگی کی ساری فضا زہر آلود ہو جائے گی۔۔ اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے۔

وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهِ

(النساء۔ ۱۲۹-۱۳۰)

اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے سے زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر (یہ نہ ہو سکے) اور زوجین ایک دوسرے سے جُدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانۂ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرے گا۔

پھر جگہ جگہ احکام بیان کرنے کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ۔

فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ۔

(البقرہ۔ ۲۲۹)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھا جائے یا احسان (خوش اسلوبی) کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ (الطلاق۔ ۲)

یا تو بھلے طریقہ سے ان کو اپنے پاس رکھو یا بھلے طریقہ سے ان سے جُدا ہو جاؤ۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

(النساء۔ ۱۹)

اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح رہو۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا

یا تو بھلے مانسوں کی طرح ان کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح رخصت کر دو۔ محض ستانے کیلئے ان کو نہ روک رکھو کہ ان کی حق تلفی کرنے

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ — لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر خود ظلم کرے گا (یعنی اپنے آپ کو خدا کے عذاب کا مستحق بنائے گا)

(البقرہ - ۲۳۱)

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ — اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو (یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو)

(البقرہ - ۲۳۷)

طلاق رجعی کے احکام جہاں بیان کیئے گئے ہیں وہاں رجوع کے لیئے نیک نیتی کی شرط لگا دی گئی - یعنی دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق سے پہلے شوہر کو یہ حق تو ہے کہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کر لے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کی نیت صلح و آشتی کے ساتھ رہنے کی ہو نہ کہ ستانے اور لٹکائے رکھنے کی - وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا - (البقرہ - ۲۲۸)

غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کی قباحت

یہی وجہ ہے کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیئے تمام اُن غیر مسلموں سے ازدواجی تعلق کو ممنوع کر دیا گیا ہے جو اہلِ کتاب نہیں ہیں - کیونکہ وہ اپنے مذہب اپنے خیالات، اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنے طور طریقوں میں مسلمانوں سے اتنے مختلف ہیں کہ ایک حقیقی مسلمان کا دلی محبت اور قلب و روح کی یک جہتی کے ساتھ ان سے میل نہیں ہو سکتا - اگر اس اختلاف کے باوجود وہ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے جائیں تو ان کا ازدواجی رشتہ کوئی صحیح تمدنی رشتہ نہ ہوگا بلکہ محض ایک شہوانی رشتہ بن جائے گا - اور اس میں یا تو مودّت و رحمت نہ ہو گی یا اگر ہو گی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لیئے اور خود اس مسلمان کے لیئے مفید ہونے کے

بجائے الٹی مضر ہو جائے گی۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ (البقرہ - ۲۲۱)

"مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند ہو اور مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں ایک مومن غلام ایک مشرک شریف زادے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔"

اہلِ کتاب کے معاملہ میں اگرچہ قانون اس کی اجازت دیتا ہے کہ ان کی عورتوں سے نکاح کر لیا جائے[1]۔ کیونکہ تہذیب کے مبادی میں ایک حد تک ہمارے اور

---

[1] اہلِ کتاب مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح پھر بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ عورت کی فطرت میں اثر پذیری اور قبولیت کا مادہ نسبتاً زیادہ ہوتا ہے اس لئے ایک غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی میں غیر مسلم شوہر کے ساتھ اس کے رہنے سے یہ خطرہ زیادہ ہے کہ وہ ان کا رنگ اختیار کرے گی اور یہ توقع بہت کم ہے کہ انہیں اپنے رنگ میں رنگ لے گی۔ نیز اگر وہ ان کا اثر قبول نہ کرے تو یہ امر یقینی ہے کہ اس کا یہ رشتہ محض ایک شہوانی رشتہ بن کر رہ جائے گا۔ نہ غیر مسلم شوہر سے وہ مودّت و رحمت کے ساتھ پیوستہ ہو سکے گی اور نہ غیر مسلم خاندان اور سوسائٹی کے ساتھ اس کا کوئی مفید تمدنی رابطہ قائم ہو سکے گا۔

ان کے درمیان اشتراک ہے لیکن اس کو بھی اسلام میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے۔ کعب بن مالک رضؓ نے ایک کتابیہ سے نکاح کرنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع فرما دیا اور ممانعت کی وجہ یہ ارشاد فرمائی اِنَّهَا لَا تُحْصِنُكَ "وہ تجھے محصن نہیں بنا سکتی" مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں دونوں کے درمیان وہ مودّت و رحمت نہ ہوگی جو احصان کی اصلی روح ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک یہودیہ سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عمرؓ نے کتابیات سے نکاح کو بصراحت مکروہ فرمایا ہے اور حضرت علیؓ نے کراہیت کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ۔ یعنی جو مومن ہے وہ ایسے لوگوں سے محبت نہیں کر سکتا جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں۔ اور جب زوجین میں محبت ہی نہ ہو تو ایسا نکاح کس کام کا؟

مسئلہ کفاءت

خود مسلمانوں کے درمیان بھی شریعت یہ چاہتی ہے کہ ازدواجی تعلق ایسے مرد و عورت کے درمیان قائم ہو جن کے درمیان، غالب حال کے لحاظ سے، مودّت و رحمت کی توقع ہو، اور جہاں یہ توقع نہ ہو وہاں رشتہ کرنا مکروہ ہے یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح سے پہلے عورت کو دیکھ لینے کا حکم دیا کم از کم مشورہ دیا ہے۔

اذا خطب احدکم المرأة	جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو
فان استطاع ان ینظر الی ما	نکاح کا پیغام دے تو حتی الامکان اسے دیکھ

یدعوہ الی نکاحھا فلیفعل۔ لینا چاہیے کہ آیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے
(ابوداؤد) جو اس کو اس عورت سے نکاح کی رغبت دلانے والی ہو۔

اور یہی وجہ ہے کہ شریعت نکاح کے معاملہ میں کفاءت (ہمسری) کو ملحوظ رکھنا پسند کرتی ہے اور غیر کُفو میں نکاح کو مناسب نہیں سمجھتی۔ جو عورت اور مرد اپنے اخلاق میں، اپنی دینداری میں، اپنے خاندان کے طور طریقوں میں، اپنی معاشرت اور رہن سہن میں، ایک دوسرے سے مشابہت یا کم از کم قریبی مماثلت رکھتے ہوں، ان کے درمیان مودّت و رحمت کا رابطہ پیدا ہونا زیادہ متوقع ہے اور ان کے باہمی ازدواج سے یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں کے خاندان بھی اس رشتہ کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو سکیں گے۔ بخلاف اس کے جن کے درمیان یہ مماثلت موجود نہ ہو، ان کے معاملہ میں زیادہ تر اندیشہ یہی ہے کہ وہ گھر کی زندگی میں، اور اپنے قلبی و روحی تعلق میں، ایک دوسرے سے متصل نہ ہو سکیں گے اور اگر شخصاً میاں اور بیوی باہم متصل ہو بھی جائیں تو کم ہی یہ امید کی جا سکتی ہے کہ دونوں کے خاندان آپس میں مل سکیں۔ شریعِ اسلامی میں مسئلہ کفاءت کی یہی اصل ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ صیانتِ اخلاق و عفت کے بعد دوسری چیز جو اسلام کے قانونِ ازدواج میں مقصدی اہمیت رکھتی ہے وہ زوجین کے درمیان مودّت و رحمت ہے۔ جب تک ان کے تعلقات میں اس چیز کے باقی رہنے کی امید ہو، اسلامی قانون ان کے رشتۂ مناکحت کی حفاظت پر اپنی پوری قوت صرف کرتا ہے۔ مگر جب یہ مودّت و رحمت باقی نہ رہے اور اس

کی جگہ بے دلی، سرد مہری، نفرت اور بیزاری پیدا ہو جائے، تو قانون کا میلان رشتۂ نکاح کی گرہ کھول دینے کی طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ بھی اس قابل ہے کہ اس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ کیوں کہ جو لوگ اس کو نظر انداز کر کے قانونِ اسلام کے اصولوں کو جزئیات پر منطبق کرتے ہیں وہ قدم قدم پر ایسی غلطیاں کر جاتے ہیں جن سے قانون کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

اصولِ قانون

قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اسلامی قانونِ ازدواج کی تدوین کن اصولوں پر کی گئی ہے۔ اس لیے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں، جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصلِ اوّل

اصولِ قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ اس درجے کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ (النساء۔ ۳۴)

"مرد عورتوں پر قوّام ہیں، اس بناء پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں بتوفیق الٰہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔"

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو قوام[1] کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں فلسفۂ اجتماع کی بحث ہے۔ اپنے موضوع زیر بحث کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بہرحال زوجین میں سے ایک کا قوام اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی اختیارات رکھنے والے ہوں تو بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ جیسی کہ فی الواقع اُن قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے، اس لیے کہ اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو قوام اور صاحب امر، اور دوسرے کو مطیع اور ماتحت بنانا ضروری سمجھا اور قوامیت کے لیے اُس فریق کا انتخاب کیا جو فطرتاً یہی درجہ لے کر پیدا ہوا ہے[2]۔

مرد کے فرائض:۔

پس اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مرد کی حیثیت قوام کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

---

[1] قوام (Sustainer, Provider) حاکم، محافظ سربراہ کار، معاملات کا منتظم اور نگران (Protector)

[2] اس بحث کو اگر کوئی صاحب مفصل دیکھنا چاہیں تو میری کتاب "پردہ" ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) **مہر** ۔ یہ کہ وہ عورت کا مہر ادا کرے ۔ کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ مہر کا معاوضہ ہیں ۔ اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے "اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ سے مرد ہی قوامیت کا مستحق ہے مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی صورت میں خرچ کرتا ہے" اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے ۔ مثلاً :

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۚ (النساء ۔ ۴) — اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو ۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ (النساء ۔ ۲۴)

اِن محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں تاکہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو حاصل کرنے کی خواہش کرو ۔ قیدِ نکاح میں لانے کے لئے نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لیے ۔ پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے میں قرار داد کے مطابق ان کے مہر ادا کرو ۔

فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۔ ۲۵) — پس لونڈیوں کے ساتھ ان کے مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو ۔ اور مناسب طور پر ان کے مہر ادا کرو ۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ — اور حلال کی گئیں تمہارے لیے عزت دار عورتیں مومنوں میں سے اور عزت دار عورتیں

مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔ (مائدہ ۔ ۵) — اُن لوگوں میں سے جن کے پاس تم میں سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جبکہ تم ان کے مہر ادا کرو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو پورا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لئے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت[1] دے۔ یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے۔ یا اس پر احسان کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا — پھر اگر وہ خوش دلی کیسا تھ مہر میں سے کچھ

---

[1] ۔ اسی کو مہر مؤجل کہتے ہیں۔ مگر آج کل مہر مؤجل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ نکاح کے وقت ہزاروں لاکھوں کی دستاویز یہ سمجھ کر لکھ دی جاتی ہے کہ "کون لیتا ہے کون دیتا ہے"۔ گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی۔ حالانکہ اس نیت کے ساتھ جو نکاح کیا جاتا ہے وہ عند اللہ فاسد ہے۔ حقیقی مہرِ مؤجل وہ ہے جس میں واضح طور پر مدت کا تعین کیا گیا ہو کہ مرد اتنی مدت میں اسے ادا کرے گا۔ اور جس مہر کی قرارداد میں مدت کا تعین نہ ہو وہ عند الطلب (On Demand) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے ان فقہا سے سخت اختلاف ہے جو ایسے مہر کو شوہر کی وفات کے بعد واجب الادا بتاتے ہیں۔ گویا نکاح تو شوہر کرے اور مہر اس کے وارثوں پر عائد ہو۔ یہ چیز مذکورۃ بالا آیاتِ قرآنی کی روح کے بالکل خلاف ہے اور اس فتوے کیلئے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہیں ہے ۔

فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا (النساء۔۴) معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (النساء۔۴) اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں کم زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۲) **نفقہ** ۔ شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے ۔قانونِ اسلام نے زوجین کے حدودِ عمل کی واضح طور پر تقسیم کر دی ہے ۔عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ہے ۔یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر شوہر کو اپنی بیوی پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے اور یہ چیز قوامیت کے عین مفہوم میں داخل ہے۔ قوام کہتے ہی اس شخص کو ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبر گیری کرنے والا ہو اور اسی حیثیت سے اس شے پر اقتدار رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ الخ میں وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اُسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے ۔اگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت، اس کا نکاح فسخ کر دے گا۔ لیکن نفقے کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے ۔قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق ۔یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے

جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو، یا مال دار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

(۳) ظلم سے اجتناب۔

مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات دیئے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً

ایلاء:-

عورت کے واجبات نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائز کے بغیر[۱] اعراض کرنا جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لئے قانونِ اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلق زن و شوہر قائم کرلے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (بقرہ - ۲۲۷)

جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھالیتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کرلیں تو اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

---

[۱] عذر جائز سے مراد ہے مرد یا عورت کی بیماری۔ یا مرد کا حالتِ سفر میں ہونا یا کوئی ایسی صورت پیش آجانا جس میں مرد بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے کا موقع نہ ہو۔

اس مسئلہ میں بعض فقہا نے حلف کی شرط لگائی ہے ، یعنی اگر شوہر نے بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاء ہو گا اور یہ حکم جاری کیا جائے گا۔ لیکن اگر قسم نہیں کھائی، تو خواہ وہ بیوی سے ناراض ہو کر دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے ، اُس پر ایلاء کا اطلاق نہ ہو گا۔ لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میرے دلائل حسبِ ذیل ہیں۔

اوّل یہ کہ قرآن مجید اگر کسی خاص صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم دے اور ایسے الفاظ استعمال کرے جن کا اطلاق اُسی صورتِ معاملہ پر ہوتا ہو، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس حکم کا اطلاق اُسی صورتِ معاملہ پر ہو گا۔ مثال کے طور پر قرآن نے سوتیلی بیٹی کو اس کے باپ پر حرام کرنے کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ "اور تمہاری وہ پروردہ لڑکیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے" اس سے صرف ان لڑکیوں کے حرام ہونے کا حکم نکلتا ہے جو چھوٹی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ سوتیلے باپ کے گھر آئی ہوں۔ مگر کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں ہے کہ یہ حکم صرف اسی صورت کے لیے خاص ہے۔ بلکہ سب اُس لڑکی کے حرام ہونے پر بھی متفق ہیں جو سوتیلے باپ سے اپنی ماں کے نکاح کے وقت جوان ہو اور جس نے ایک دن بھی اُس باپ کے گھر میں پرورش نہ پائی ہو۔ اسی طرح اگر قرآن نے لفظ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ (بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھا لیتے ہیں) کے الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کے لیے جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ صرف قسم کھانے والے لوگوں ہی کے لیے خاص ہو۔

دوم یہ کہ احکامِ فقہیہ کے استنباط میں یہ اصول قریب قریب ساری امت میں متفق علیہ ہے کہ جس صورتِ معاملہ کے متعلق کوئی حکم نہ پایا جاتا ہو، اُس کو کسی ایسی صُورتِ معاملہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے جس کے بارے میں حکم موجود ہو۔ بشرطیکہ دونوں میں علّتِ حکم مشترک ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ شارع نے ایلاء کرنے والوں کے لیے چار مہینے کی مدت کس لیے مقرر کی ہے؟ اور کیوں یہ فرمایا ہے کہ اگر اس مدت کے اندر رجوع نہ کرو تو پھر طلاق دے دو؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور بتائی جا سکتی ہے کہ چار مہینے سے زیادہ مدت تک مقاربت سے پرہیز کرنا عورت کے لئے موجبِ ضرار ہے اور شارع ضرار ہی کو روکنا چاہتا ہے؟ اسی آیت سے اگلے رکوع میں شارع کا یہ ارشاد موجود ہے کہ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (ان کو محض ضرار کے لیے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو) اور سورۂ نساء میں شارع فرماتا ہے فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (پس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جُھک پڑو کہ دوسری کو معلّق چھوڑ دو)۔ ان اشارات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو نکاح میں بھی رکھنا اور پھر اسے معلّق رکھ چھوڑنا اور محض ستانے کے لئے روک رکھنا شارع کو پسند نہیں ہے۔ اس کے سوا چار مہینے کی مدّت مقرر کرنے کی کوئی دوسری علّت بیان نہیں کی جا سکتی۔ اب اگر یہی علّت اس صورت میں بھی پائی جاتی ہو جب کہ شوہر قسم کھائے بغیر بیوی سے قصداً مباشرت کرنا چھوڑ دے تو کیوں نہ اس پر بھی یہی حکم نافذ کیا جائے؟ آخر قسم کھانے یا نہ کھانے سے نفسِ ضرار میں کیا فرق واقع ہو جاتا ہے؟ کیا کوئی معقول آدمی یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ شوہر قسم کھا کر ترکِ مباشرت کرے تو ضرار ہو گا۔ اور اگر اس نے قسم نہ کھائی ہو تو ساری عمر بھی اس بیوی کے پاس

نہ جانے سے کوئی ضرار نہ ہوگا۔

سوم یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ازدواجی قانون کا اہم ترین مقصد اخلاق اور عصمت کی حفاظت ہے۔ ایک مرد اگر ایک بیوی سے ناراض ہو کر دوسری بیوی کر لے تو وہ اس طرح اپنے آپ کو بدکاری و بدنظری سے بچا سکتا ہے۔ لیکن وہ عورت جسے اس کے شوہر نے خواہشاتِ نفس کی تسکین سے مستقل طور پر محروم کر رکھا ہو، کس طرح اپنے اخلاق کی حفاظت کر سکتی ہے جب تک کہ اس کا شوہر اس کی طرف رجوع نہ کرے؟ کیا شارعِ حکیم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسی عورت کے شوہر نے اگر اس سے الگ رہنے کی قسم کھائی ہو تب تو وہ اس کے اخلاق کی حفاظت کا بندوبست کرے گا ورنہ اسے غیر محدود مدت تک بداخلاقی کے خطرے میں مبتلا چھوڑ دے گا؟

ان وجوہ سے میرے نزدیک فتوائے فقہائے مالکیہ کے مسلک پر ہونا چاہیے جو فرماتے ہیں کہ "اگر شوہر بیوی کو تکلیف دینے کی نیت سے مباشرت ترک کر دے تو اس پر بھی ایلاء ہی کا حکم لگایا جائے گا، اگرچہ اس نے قسم نہ کھائی ہو۔ کیونکہ ایلاء پر پابندی عائد کرنے سے شارع کا مقصود ضرار کو روکنا ہے اور یہ علت اس ترکِ مباشرت میں بھی پائی جاتی ہے جو حلف کے بغیر بقصدِ ضرار کیا جائے[1]۔"

فَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ کی تفسیر میں بھی فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان، زید بن ثابت، ابنِ مسعود اور ابنِ عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت کا گزر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے

---

[1] احکام القرآن لابن عربی جلد ۱ صفحہ ۷۵۔ و بدایۃ المجتہد لابن رشد جلد ۲ صفحہ ۸۰

کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہٰذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اس معنی میں منقول ہے۔ مگر ایک دوسرا قول جو موخر الذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ اپنی بیوی سے رجوع کر و یا اس کو طلاق دے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالےٰ نے ایلاء کرنے والوں کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہی ہے۔ اس کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت بجز طلاق اور جدائی کے اور کوئی نہیں ہے[1]۔ اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے، اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے۔

ضرار اور تعدی:۔

عورت سے رغبت نہ ہو، اس کو رکھنا نہ چاہے، مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے اس کو رکھ چھوڑے۔ بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق سے پہلے رجوع کر لے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لئے

---

[1] یہ امر مختلف فیہ ہے کہ یہ طلاق، ایک طلاق بائن کے حکم میں ہے یا رجعی کے حکم میں۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (بقرہ - ۲۳۱)

نہ روک رکھو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اُوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی آیات کا مذاق نہ بنالو۔ [1]

ضرار اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے گا۔ روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا۔ ادنیٰ طبقہ کا ہوگا تو مار پیٹ اور گالم گلوج کرے گا۔ اونچے طبقے کا ہوگا تو تذلیل اور ایذا رسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ سب پر حاوی ہیں اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں۔

---

[1] قانون کے الفاظ سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھانا جو قانون کے مقصد اور اس کی روح کے خلاف ہو، دراصل قانون سے کھیلنا اور اس کا مذاق بنانا ہے۔ قرآن میں مرد کو ایک طلاق یا دو طلاق دے کر رجوع کر لینے کا جو حق دیا گیا ہے وہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ اگر اس دوران میں زوجین کے درمیان مصالحت ہو جائے اور ان کے باہم مل جل کر رہنے کی کوئی صورت نکل آئے تو شریعت کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق دے۔ پھر عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لے۔ پھر طلاق دے اور پھر رجوع کر لے اور اس حرکت سے اس کی غرض یہ ہو کہ عورت کو خواہ مخواہ لٹکائے رکھے، نہ اپنے گھر میں بسائے اور نہ اسے آزاد ہی کرے کہ بیچاری کہیں اور نکاح کر سکے، تو یہ خدا کے قانون سے مسخرہ پن اور کھیل ہے، جس کی جرأت کوئی سچا مومن نہیں کر سکتا۔

جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے ۔

ازواج میں عدل نہ کرنا :-

متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا ظلم ہے جسے قرآن مجید صاف الفاظ میں ناجائز ٹھہراتا ہے ۔

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۔ (النساء - ۱۲۹)

کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو ۔

قرآن مجید میں تعدّدِ ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے - اگر کوئی شخص عدل نہ کرے تو اسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے - خود اس آیت میں بھی جہاں تعدّدِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۔ (النساء - ۳)

پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو - یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو - یہ زیادہ قرینِ مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اَلَّا تَعُوْلُوْا کے معنی یہ کئے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے - لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے ۔

لُغت میں عَوَل کے معنی مَیل کے ہیں ۔ ابوطالب کا شعر ہے ۔

بمیزانِ صِدقٍ لَا یخسُ شعیرۃ   وَ وَزّانُ قِسطٍ وزنہ غیر عائل

یہاں عائل بمعنی مائل مستعمل ہُوا ہے ۔ اسی بنا پر عَوَل کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ ابن عباسؓ ، حسن ، مجاہد ۔ شعبی عکرمہ اور قتادہ وغیرہم نے لَا تَعُوْلُوْا کے معنی لَا تَمِیْلُوْا عَنِ الْحَقِّ کیے ہیں لہذا قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا ، اور ایک کی طرف جُھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے ۔ تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے ۔ قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے ۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے اس میں مساوات برتنے پر نہ انسان قادر ہے اور نہ اس کے لیے مکلف ۔ وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۔ البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلقات زن و شو میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے ۔

مرد کے ظلم کی تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے ۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودت و رحمت کے منافی ہیں ۔ مگر ان میں

قانون کے لئے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لئے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہیئے۔ رات دن کی تھکا فضیحتی کے ساتھ زندگی گزارنا حماقت ہے۔ اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو۔ نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔

قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ ممکن ہی ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے۔ لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ عدل و انصاف اور رحمت و مودّت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق :-

مرد کو قوامیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اُوپر بیان ہوئیں۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

(۱) حفظ للغیب: عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہتا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ	جو نیک عورتیں ہیں وہ اطاعت کرنے والی
لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ۔	اور غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں، اللہ تعالیٰ
(النساء - ۳۴)	کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں حفظ للغیب سے مراد ہر اُس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اُس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس رہے۔ اُس میں اس کے نسب کی حفاظت، اس کے نطفے کی حفاظت، اُس کی آبرو کی حفاظت، اس کے مال کی حفاظت،

اُس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

(۲) شوہر کی اطاعت، مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (النساء: ۳۴) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً

اِن لکُمْ عَلَیْھِنَّ اَن لَّا یوطِئْن فُرُشَکُمْ اَحَدًا تکرھونه	تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔

لَا تصدّق بشیٔ مِن بَیْتِہٖ اِلَّا بِاِذْنِہٖ فَاِن فعلت کان لہٗ الْاَجْرُ وَ عَلَیْھَا الوزرُ ولا تخرج مِن بَیْتِہٖ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرے۔ اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا۔ نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لَا تصوم المرأۃ یومًا و زوجُھَا شَاھد مِن غَیْرِ رَمَضَان اِلَّا بِاِذْنِہٖ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)	عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے سوا نفل روزے اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی نہ رکھے۔
خیرُ النّساء امرأۃ اذا نظرت	بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو

اَيْهَا سَرَتْكَ وَاِذَا اَمَرْتَهَا اَطَاعَتْكَ وَاِذَا غِبْتَ عَنْهَا حَفِظَتْكَ فِيْ مَالِكَ وَنَفْسِهَا	دیکھے تو تیرا دل خوش ہو جائے اور جب تو اس کو حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے ۔

اس عام حکمِ اطاعت میں صرف ایک استثناء ہے ، اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس کا حکم ماننے سے انکار کر سکتی ہے بلکہ اسے انکار کر دینا چاہیے ۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے ۔ یا شراب پینے کا حکم دے ، یا پردہ شرعی ترک کر لے ، یا فواحش کا ارتکاب اس سے کرانا چاہے ، تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے ، بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرا دے ۔ اس لیے کہ خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ۔ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ ۔ اس صورتِ خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے اگر نہ کرے گی تو نافرمان ہو گی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہو گا جن کی تفصیل آگے آتی ہے ۔

مرد کے اختیارات :-

قانونِ اسلام نے چونکہ مرد کو قوّام بنایا ہے اور اس پر عورت کے مہر ، نفقے اور نگہبانی و خبر گیری کی ذمہ داری عائد کی ہے ، اس لیے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے اور اپنے گھر کے اخلاق اور

حسنِ معاشرت کی حفاظت کرنے اور خود اپنے حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے لیئے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانونِ اسلام میں ان اختیارات کو بالوضاحت بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کر دیئے گئے ہیں، جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کیئے جا سکتے ہیں۔

(۱) **نصیحت، تادیب اور تعزیر:** اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے۔ یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے برتاؤ میں حسبِ ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے۔ اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا (النساء۔ ۳۴)	اور جن عورتوں سے تم نشوز[1] دیکھو ان کو نصیحت کرو۔ اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی طریقہ نہ ڈھونڈو۔

اس آیت میں وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) فرما کر سزا کے طور پر ترکِ مباشرت کی اجازت دی گئی ہے۔ مگر آیتِ ایلاء،

---

[1] نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے، خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے۔

نے، جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ، اس کے لئے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے کہ یہ بستر کی علیٰحدگی چار مہینے سے زیادہ نہ ہو۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الٰہی اس کو طلاق دے دے گا ، اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے ، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے ۔ چار مہینے کی مدت ادب سکھانے کے لیے کافی ہے ۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا۔ کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا ، یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے ، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ۔ یا وہ حسنِ معاشرت کے ساتھ کم از کم اس شوہر سے نباہ نہیں کر سکتی۔ نیز اس سے ان مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیئے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتۂ مناکحت میں باندھا جاتا ہے ۔ ممکن ہے ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لیئے کسی ناجائز طریقے کی طرف مائل ہو جائے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے ۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں میاں بیوی میں سے ایک اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی ۔

امام سفیان ثوری سے وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ کے معنی میں ایک دوسرا قول منقول ہے ۔ وہ کلام عرب سے استدلال کر کے کہتے ہیں کہ ھجر کے معنی ، باندھنے کے ہیں هَجَرَ الْبَعِيرَ اذا ربطه صَاحِبُهُ بِالْهِجَارِ ۔ ہجار اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ

کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔ لیکن یہ معنی قرآن مجید کے منشاء سے بعید ہیں۔ فِی الْمَضَاجِعِ کے الفاظ میں قرآن نے اپنے منشاء کی طرف صاف اشارہ کر دیا ہے مضجع سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور سونے کی جگہ میں باندھنا بالکل بے معنی بات ہے۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے۔ مگر اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قید لگا دی ہے کہ ضربِ شدید نہ ہونی چاہیے۔

اِضْرِبُوْهُنَّ اِذَا عَصَیْنَكُمْ	اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں
فِی الْمَعْرُوْفِ ضَرْبًا غَیْرَ مُبَرِّحٍ	تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔
وَلَا یَضْرِبُ الْوَجْهَ وَلَا یُقَبِّحُ	منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا مرد کو اختیار دیا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جا سکتی ہے جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہو۔ نہ یہ کہ ہر جا و بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ۔ "جو کوئی تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے"۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پہ ترکِ کلام، اور جس پر ترکِ کلام کافی ہے اس پہ ھجر فی المضاجع اور جس پہ

مجمع فی المصابیح کافی ہے اس پر مارنا ظلم میں شمار ہو گا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صرف شدید اور ناقابلِ برداشت قصور پہ ہی دی جا سکتی ہے اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کی زیادتی ہو گی اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے امداد طلب کرے۔

(۲) **طلاق**۔ دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دے دے۔ چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوقِ زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لیے ان حقوق سے دست بردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے[۱]۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہو جائے تو

---

[۱] بعض لوگ اہلِ مغرب کی تقلید میں یہ چاہتے ہیں کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر سے چھین کر عدالت کو دے دیا جائے۔ چنانچہ ٹرکی میں ایسا کر بھی دیا گیا ہے۔ لیکن یہ چیز قطعی طور پر قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن نے طلاق کے احکام بیان کرتے ہوئے ہر جگہ فعلِ طلاق کو شوہر کی طرف منسوب کیا ہے۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ۔ فَاِنْ طَلَّقَهَا۔ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ وغیرہ۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ طلاق دینے کا اختیار شوہر کو دیا گیا ہے۔ پھر قرآن صاف الفاظ میں شوہر کے متعلق کہتا ہے کہ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ۔ ۲۳۷) "نکاح کی گرہ اس کے ہاتھ میں ہے"۔ اب کون یہ حق رکھتا ہے کہ اس گرہ کو اس کے ہاتھ سے چھین کر قاضی کے ہاتھ میں دے دے۔ ابن ماجہ میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا زر پیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا، وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور صرف اُس وقت اسے چھوڑے گا، جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو گا۔ لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک فریق ہو اور ضائع کرنیکا اختیار دوسرے فریق کو مل جائے تو اس دوسرے فریق سے یہ امید کم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس فریق کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۴۵) شکایت کی کہ میرے آقا نے اپنی لونڈی کا نکاح مجھ سے کیا تھا۔ اب وہ اسے مجھ سے جدا کرنا چاہتا ہے۔ اس پر آپؐ نے اپنے خطبے میں فرمایا۔ یا ایہا الناس ما بال احدکم یزوج عبدہ امتہ ثم یرید ان یفرق بینھما، انما الطلاق لمن اخذ بالساق ۔ لوگو! یہ کیا ماجرا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام سے اپنی لونڈی بیاہ دیتا ہے۔ اور پھر دونوں کو جدا کرنا چاہتا ہے۔ طلاق کا اختیار تو شوہر کو ہے ۔ یہ حدیث اگرچہ سنداً قوی نہیں ہے، مگر قرآن کی مطابقت اس کو قوت بخشتی ہے۔ پس قولِ خدا و رسولؐ کی بنا پر یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ طلاق دینے کے اختیارات شوہروں سے چھین کر عدالتوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اور عقلاً بھی یہ بالکل ایک غلط حرکت ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ یورپ کی طرح ہمارے ہاں بھی خانگی زندگیوں کے شرمناک جھگڑوں اور بدنما واقعات کی برسرِ عدالت تشہیر ہونے لگے ۔

اصلِ دوم

اسلامی قانونِ ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور رشتۂ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہت اور طبائع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس صورت میں ان کے لئے اور سوسائٹی کے لئے بہتر یہی ہے کہ اُن کی علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے۔ اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے، جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں مل سکتی۔ ایک طرف وہ رشتۂ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے، مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور مسیحیت میں ہے کہ زوجین کے لئے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے، بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہو سکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے، مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہی اور رشتۂ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا انتظام درہم برہم ہونے لگا۔

اس اصل کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ طلاق،

خُلع اور تقاضائے قاضی۔

طلاق اور اس کی شرائط:-

اصطلاحِ شرعی میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ مرد اپنے اِس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے اُن حقوقِ زوجیت سے دست بردار ہو سکتا ہے جن کو اس نے مہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا۔ مگر شریعت طلاق کو پسند نہیں کرتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی الطَّلَاقُ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور تَزَوَّجُوْا وَلَا تُطَلِّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الذَّوَّاقِیْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو۔ کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا) اس لئے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے، جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو، تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو۔

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ج	ان کے ساتھ اچھے سلوک سے رہو۔ اگر وہ
فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا	تم کو ناپسند بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی
شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ	چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت
خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء۔۱۹)	کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو۔ مگر یک

لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک طُہر کے فاصلے سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے طُہر کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے۔ یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش آئند تغیّر ہو جائے۔ یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیئے تو پھر چاہو تو تیسرے طُہر پر آخری طلاق دے دو۔ ورنہ رجوع کئے بغیر یونہی عدّت گذر جانے دو۔[1]

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (البقرہ - ۲۲۹)	طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا پھر شریفانہ طریقہ سے چھوڑ دیا جائے۔
وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ	مُطلّقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک

---

[1] احسن طریقہ یہ ہے کہ تیسری مرتبہ طلاق نہ دی جائے۔ بلکہ یوں ہی عدّت گذر جانے دی جائے۔ اس صورت میں یہ موقع باقی رہتا ہے کہ اگر یہ زوجین باہم نکاح کرنا چاہیں تو دوبارہ ان کا نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن تیسری بار طلاق دینے سے طلاق مُغلّظ ہو جاتی ہے جس کے بعد تحلیل کے بغیر سابق زن و شوہر کا ایک دوسرے سے پھر نکاح نہیں ہو سکتا۔ افسوس یہ ہے کہ لوگ بالعموم اس مسئلے سے ناواقف ہیں۔ اور جب طلاق دینے پر آتے ہیں تو چھوٹتے ہی تین طلاق دے ڈالتے ہیں۔ بعد میں پچھتاتے ہیں اور مفتیوں سے حیلے پوچھتے پھرتے ہیں۔

بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوٓءٍ ...... وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا إِصْلَاحًا

(البقرہ-۲۲۸)

انتظار میں رکھیں ...... اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں تو اس مدت میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہوں گے۔

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین حیضوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے بھیج نہ دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو، ممکن ہے کہ ساتھ رہنے بسنے سے دل ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ رَبَّكُمْ ۖ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذَٰلِكَ أَمْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

(الطلاق - ۱-۲)

جب تم عورتوں کو طلاق دو تو زمانہ عدت میں رجوع کی گنجائش رکھتے ہوئے طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں سے نکال نہ دو۔ اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی برائی کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد

کوئی اصلاح کی صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ مدّتِ مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں، تو یا ان کو بھلے طریقے سے روک لو یا بھلے طریقے سے جُدا ہو جاؤ۔

پھر حالتِ حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طُہر کی حالت میں دو۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ حیض کی حالت میں عموماً عورتیں چڑچڑی اور بدمزاج ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کے جسمانی نظام میں کچھ ایسا تغیّر واقع ہو جاتا ہے کہ بلا ارادہ ان سے وہ باتیں سرزد ہونے لگتی ہیں، جنہیں عام حالت میں وہ خود پسند نہیں کرتیں۔ یہ ایک طبّی حقیقت ہے۔ اس لئے زمانہ حیض میں میاں اور بیوی میں جو نزاع واقع ہو جائے اس پر طلاق دینے سے منع کر دیا گیا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں زوجین کے درمیان وہ جسمانی تعلق نہیں ہوتا جو ان کی باہمی دلچسپی و چسپیدگی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس زمانے میں دونوں کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جانا بعید نہیں ہے۔ یہ رکاوٹ دور ہو جانے کے بعد توقع کی جا سکتی ہے کہ شاید جذباتِ لطیف زوجین کو پھر باہم شیر و شکر کر دیں اور وہ غبار دُور ہو جائے جو شوہر کو طلاق کی طرف مائل کر رہا تھا۔

انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ عبد اللہؓ بن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حیض کے زمانہ میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سُن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دے دو کہ رجوع کرے

اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمرؓ کو اس فعل پر توبیخ فرمائی اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی۔

"ابن عمر تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طُہر کا انتظار کرو۔ پھر ایک ایک طُہر پر ایک ایک طلاق دو۔ پھر جب وہ (تیسری مرتبہ) طاہر ہو تو اُس وقت یا طلاق دے دو یا اس کو روک لو۔"

حضرت ابن عمرؓ نے عرض کیا۔

يَا رَسُولَ اللّٰهِ أَرَأَيْتَ لَوْ كُنْتُ طَلَّقْتُهَا ثَلَاثًا أَكَانَ لِي أَنْ أُرَاجِعَهَا

"اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟"

حضورؐ نے فرمایا:۔

لَا كَانَتْ تَبِيْنُ وَتَكُوْنُ مَعْصِيَةً ۔۔

"نہیں، وہ جُدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا"[1] (دار قطنی و ابن ابی شیبہ)

اس سے ایک اور بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے۔ دراصل یہ فعل شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے۔ اور اس سے اللہ کی وہ حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورۂ طلاق میں سخت تاکیدی حکم دیا گیا ہے[2] حضرت

---

[1] جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم بیان کر آئے ہیں، شریعت کا منشاء تو یہ ہے کہ جو ازدواجی تعلق ایک مرتبہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان قائم ہو گیا اسے حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اور اگر توڑا بھی جائے تو اس وقت جب کہ نباہ اور مصالحت کے تمام امکانات

عمرؓ ابن خطاب کے متعلق منقول ہے کہ جو شخص مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا ان کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جُدا کر دیتے۔

حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

آپ نے فرمایا:۔

اِنَّهٗ قَدْ عَصٰی رَبَّهٗ وَبَانَتْ امْرَأَتُهٗ (ابن جریر)

"اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس کی عورت اس سے جُدا ہو گئی۔"

حضرت علی رضؓ فرماتے ہیں:۔

لَوْ اَنَّ النَّاسَ اَصَابُوْا حَدَّ الطَّلَاقِ مَا نَدِمَ اَحَدٌ عَلٰی امْرَأَتِهٖ

"اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے، تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جُدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔"

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۵) ختم ہو چکے ہوں۔ اس بنا پر شریعت چاہتی ہے کہ جو شخص بھی طلاق دے خوب سوچ سمجھ کر دے اور طلاق دینے پر بھی صلح صفائی کا دروازہ تین حیضوں تک کھلا رہے۔ مگر جو شخص بیک وقت تین طلاق دیتا ہے۔ وہ ان تمام مصلحتوں کو ایک ہی وار میں کاٹ پھینکتا ہے۔

یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاقِ مُغَلَّظہ[1] دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا تاوقتیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کر لے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا و رغبت اسے طلاق نہ دے۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ۔ (البقرہ - ۲۳۰)

پھر اگر وہ اس کو تیسری بار طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک وہ ایک دوسرے مرد سے نکاح نہ کر لے۔

یہ ایک ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کر لے کہ اسے اس عورت کے ساتھ نباہ کرنا ہی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لئے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت کو تین بار طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرا دے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوا دے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرما دی ہے کہ تحلیل کے لئے محض نکاح تزویج کافی نہیں ہے بلکہ عورت اُس وقت

---

[1] ۔ یعنی تین طلاق جن کے بعد عورت دوبارہ اس شوہر کے نکاح میں نہیں آسکتی تاوقتیکہ اس کا نکاح کسی اور شخص سے ہو کر فرقت واقع نہ ہو جائے۔

تک پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت حاصل نہ کر لے۔

لَا تَحِلُّ لِزَوْجِهَا الْاَوَّلِ حَتّٰی یَذُوْقَ الْاٰخِرُ عُسَیْلَتَهَا وَتَذُوْقُ عُسَیْلَتَهٗ۔

پھر جو شخص محض اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لئے حلال کرنے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو ایسا سازشی نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ۔ اور ایسے شخص کو آپ تیس مُسْتَعَار ذکر لئے کے سانڈھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فی الواقع اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔

خُلع :-

شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ کسی طرح نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے خُلع کر لے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور دوسرا قانونی۔

اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت، ہر ایک کو طلاق یا خلع کا اختیار

صرف ایک آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لیے طلاق اور خلع کو کھیل بنالیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ:

اِنَّ اللّٰہ لایحبُّ الذَّوَّاقِیْنَ وَالذَّوَّاقَاتِ	اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا۔
لَعَنَ اللّٰہُ کُلَّ ذَوَّاقٍ مِطلاقٍ۔	ہر طالبِ لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے۔
اَیُّمَا امْرَأۃٍ اِخْتَلَعَتْ مِنْ زَوْجِھَا بِغَیْرِ نُشُوْزٍ فَعَلَیْھَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ اَلْمُخْتَلِعَاتُ ھُنَّ اَلْمُنَافِقَاتُ۔	جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے اس کی کسی زیادتی کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت ہو گی۔ خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں۔

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے، اس پہلو سے بحث نہیں کرتا، وہ جس طرح مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لیے بوقتِ ضرورت عقدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتۂ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لیے بندھے ہوئے ہیں کہ اس گرفت سے آزاد

ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حقوق کو بیجا طور پر استعمال کرے گا، تو اس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور معقول ہے پابندیاں عاید کر دیتا ہے۔ مگر حق کے بیجا یا بے جا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیارِ تمیزی اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اُس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالبِ لذّت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائز حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اسے دینے کے بعد اس کو بے جا استعمال سے روکنے کے لئے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیحدگی کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگا دی گئی ہیں مثلاً یہ کہ جو مہر اس نے عورت کو دیا تھا، اس کا نقصان گوارا کرے، زمانۂ حیض میں طلاق نہ دے، تین طُہروں میں ایک ایک طلاق دے، عورت کو زمانۂ عدّت میں اپنے ساتھ رکھے، اور جب تین طلاق دے چکے تو پھر وہ عورت تحلیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آ سکے۔ اسی طرح عورت کو بھی خلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں۔ جن کو قرآن مجید اس مختصر سی آیت میں بتمام و کمال بیان کر دیتا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ

بِہٖ (البقرہ - ۲۲۹)

تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو اس
میں سے کچھ بھی واپس لو۔ اِلّا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ
کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف
ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے ؛ کچھ مضائقہ نہیں
اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر عقد نکاح سے آزاد ہو جائے۔

اس آیت سے حسبِ ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) خلع ایسی حالت میں ہونا چاہیئے جب کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا
خوف ہو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع
ایک بُری چیز ہے، جس طرح کہ طلاق بری چیز ہے، لیکن جب یہ خوف ہو کہ
حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی برائی نہیں۔

(۲) جب عورت عقد نکاح سے آزاد ہونا چاہے، تو وہ بھی اسی طرح مال
کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں
گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس
نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا، اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے
تو وہ اس مال کا ایک حصّہ یا پورا مال واپس کر کے جُدا ہو سکتی ہے، جو اس نے
شوہر سے لیا تھا۔

(۳) افتداء (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لئے محض
فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں ہے بلکہ اس معاملہ کا اِتمام اُس وقت
ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک

مقدار مال پیش کر کے آپ سے علیحدہ نہیں ہو سکتی ۔ بلکہ علیحدگی کے لئے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کر رہی ہے اس کو شوہر قبول کر کے طلاق دے دے ۔

(۴) خلع کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصّہ پیش کر کے علیحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کر کے طلاق دے دے ۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خلع کا فعل طرفین کی رضامندی سے مکمل ہو جاتا ہے ۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لئے عدالتی فیصلے کو شرط قرار دیتے ہیں ۔ جو معاملہ گھر کے اندر طے ہو سکتا ہے اسلام اسے عدالت میں لے جانا ہرگز پسند نہیں کرتا ۔

(۵) اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں عورت کو عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہے ۔ جیسا کہ آیت مذکورہ بالا میں فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ کے الفاظ سے ظاہر ہے ۔ اس آیت میں خِفْتُمْ کا خطاب ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر ہی کی طرف ہے چونکہ اولی الامر کا اوّلین فرض حدود اللہ کی حفاظت ہے ۔ اس لئے ان پر لازم ہو گا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوا دیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے ۔

یہ مجمل احکام ہیں جن میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف کن صورتوں میں متحقق ہو گا ؟ فدیہ کی مقدار متعیّن کرنے میں انصاف

کیا ہے ؟ اور اگر عورت افتداء پر آمادہ ہو، لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے ؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی رودادوں میں ملتی ہیں۔ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

صدرِ اوّل کے نظائر در باب خلع

خلع کا سب سے مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیویوں نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی تفصیلات کے مختلف ٹکڑے احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت اُبَیّ بن سَلول (عبداللہ ابن اُبَیّ کی بہن[1]) کا قصہ یہ ہے کہ انہیں ثابت کی صورت ناپسند تھی۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لئے مرافعہ کیا اور ان الفاظ میں اپنی شکایت پیش کی۔

یا رسولَ اللہِ لا یجمع راسی وراسہ شیئٌ ابداً انی رفعت جانب الخباء فرأیتہ اقبل فی عدۃ فاذا ھو اشد ھم سواداً واقصرھم قامۃً وا قبحھم وجھاً۔ (ابن جریر)

---

[1] بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا، مگر مشہور یہی ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا۔ اور عبداللہ ابن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

یارسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی۔
میں نے اپنا گھونگھٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کیساتھ
آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان سب سے زیادہ کالا اور سب سے زیادہ
پستہ قد اور سب سے زیادہ بدشکل تھا۔

واللہ ما کرھت منہ دینا ولا خلقا الا انی کرھت دمامتہ (ابن جریر)

خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کے سبب سے اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے اس کی بدصورتی ناپسند ہے۔

واللہ لولا مخافۃ اللہ اذا دخل علیّ بصقت فی وجہہ (ابن جریر)

خدا کی قسم اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا۔ اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔

یا رسول اللہ بی من الجمال ما تری وثابت رجل دمیم (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری)

یارسول اللہ میں جیسی خوبصورت ہوں آپ دیکھتے ہیں اور ثابت ایک بدصورت شخص ہے۔

وما اعتب علیہ فی خلق ولا دین ولکنی اکرہ الکفر فی الاسلام (بخاری ونسائی)

میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرف نہیں رکھتی۔ مگر مجھے اسلام میں کفر کا خوف ہے۔ [1]

---

[1] اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کراہت ونفرت کے باوجود اگر میں اس کیساتھ رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہ میں ان احکام کی پابند نہ رہ سکوں گی، جو شوہر کی اطاعت اور

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اتردین علیہ حدیقتہُ التی اعطاک؟ "جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کر دے گی؟" انہوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ، بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اَمَّا الزیادۃ فلا ولکن حدیقتہ۔ "زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ واپس کر دے۔" پھر ثابت کو حکم دیا کہ۔ اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ "باغ قبول کر لے اور اس کو ایک طلاق دیدے۔" (بخاری و نسائی)

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام مالکؒ اور ابوداؤدؒ نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضورؐ اپنے مکان سے باہر نکلے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا۔ لا انا ولا ثابت بن قیس۔ "میری اور ثابت کی نبھ نہیں سکتی۔" جب ثابت حاضر ہوئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے، اس نے بیان کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا یارسول اللہ جو کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴) اس کی وفاداری اور عصمت وعفت کے تحفظ کے لیے اللہ اور رسولؐ نے دیئے ہیں۔ یہ ایک مومنہ کا تصور ہے کہ حقوق اللہ کے توڑنے کو وہ کفر سمجھتی ہے۔ اور آج کل کے مولویوں کا تصور یہ ہے کہ اگر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ بھی ادا نہ کیا جائے اور کھلم کھلا فسق و فجور کا ارتکاب کیا جائے تب بھی وہ اس حالت کو ایک ایمانی حالت کہنے پر اصرار کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو جنت کی بشارتیں دیتے ہیں، اور جو اسے غیر ایمانی حالت کہے اسے خارجی ٹھیر لیتے ہیں۔

ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے۔ حضور نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے۔ بعض روایتوں میں خَلِّ سَبِیْلَھَا کے الفاظ ہیں اور بعض میں فَارِقْھَا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابوداؤد اور ابن جریر نے حضرت عائشہؓ سے اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے حبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حبیبہ نے آکر حضورؐ سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مَالِھا وفارقھا، اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔

مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو بھی ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مار پیٹ کی نہیں بلکہ بد صورتی کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے وہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں جمیلہ سے منقول ہیں، یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اِخْلَعْھَا وَیْحَکَ وَلَوْ مِنْ قُرْطِھَا۔ اس کو خلع دے دے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں

کے عوض ہی ہیں ہو یلے

رُبَیّع بنت مُعوّذ بن عَفرار نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا۔ شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمانؓ کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان رضؓ نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا موباف تک لے لے اور اس کو خلع دے دے۔ فاجازہ واصرہ باخذ عقاس رأسھا فمادونہ ؎۲

احکامِ خلع :۔

ان روایات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) فَإِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ کی تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیویوں سے منقول ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خلع کے لیے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بدصورت ہے۔ اور وہ ان کو پسند نہیں ہے۔ آپ نے ان کو خوبصورتی کے فلسفے پر کوئی لکچر نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کی نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر متحقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت وکراہت بیٹھ چکی ہے تو آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمالیا۔ کیونکہ نفرت وکراہت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج دین اور اخلاق اور تمدن کے لئے طلاق وخلع سے زیادہ خراب ہیں۔ ان سے تو مقاصدِ شریعت ہی کے فوت ہو جانے کا خوف ہے۔ پس نبی

لے کشف الغمہ ج ۲۔

سلے عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری

صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعی ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے، تاکہ کسی شبہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ اس جوڑے میں اب نباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

(۳) حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں ہے۔ اور یہ ایک معقول بات ہے۔ عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا، لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لئے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں ہے کہ جو وجوہ عورت بیان کر رہی ہے وہ نفرت کے لئے کافی ہیں یا نہیں۔

(۴) قاضی عورت کو وعظ و پند کر کے شوہر کے ساتھ رہنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے۔ اور اگر وہ اس امر کا

اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مرد کے ساتھ بہرحال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

(۵) خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے تنقیح طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالبِ خُلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدماتِ خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ کیونکہ اوّل تو اس سوال کی کماحقہ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لئے اُس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوّاقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حقِ طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوّاقیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حقِ خُلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالبِ خُلع عورت دو حال سے خالی نہ ہو گی۔ یا وہ فی الحقیقت خلع کی جائز ضرورت رکھتی ہو گی۔ یا محض ذوّاقہ ہو گی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو ردّ کرنا ظلم ہو گا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ جو عورت طبعاً ذوّاقہ ہو گی وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے

اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ بُرا ہو گا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے نکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

(۶) اگر عورت خلع مانگے اور مرد اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔ اور قاضی کا حکم بہرحال یہی معنی رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اس کے بجا لانے کا پابند ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ بجا نہ لائے تو قاضی اس کو قید کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔ قاضی کی اگر یہ حیثیت ہو تو لوگوں کے لئے اس کی عدالت کا دروازہ کھُلا ہونا محض بے معنی ہے۔

(۷) خلع کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن کا ہے یعنی اس کے بعد زمانۂ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہو گا۔ کیونکہ حقِ رجوع باقی رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ نیز چونکہ عورت نے جو مال اُس کو دیا ہے وہ عقدِ نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے، اس لئے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہو گی جس کو شریعت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طلاق مُغلّظ نہیں ہے جس کے بعد دوبارہ نکاح

کرنے کے لئے تحلیل شرط ہو۔

(۸) خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جیسے معاوضے پر بھی زوجین راضی ہوجائیں اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ناپسند فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیئے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے۔ آپؐ کا ارشاد ہے لایاخذ الرجل من المختلعۃ اکثر مما اعطاھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے بھی بالفاظِ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ آئمۂ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لئے مہر سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیساکہ ہدایہ میں ہے وان کان النشوز من قبلہ یکرہ لہ ان یاخذ منھا عوضاً۔ ان تصریحات کو دیکھتے ہوئے اس باب میں اصولِ شرع کے تحت یہ ضابطہ بنایا جاسکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خلع کے لئے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں، تو اس کو مہر کے ایک قلیل جزء یا نصف کی واپسی پر خلع دلایا جائے۔ اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لئے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے رویئے میں قاضی کو ذواقیت کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے زیادہ دینے پر مجبور کرسکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی

خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت

اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا۔ اور اصولِ شرع کے خلاف، خلع دینے یا نہ دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں۔ بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیتہً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدودِ اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دینا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہو گیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لئے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشاء ہرگز نہ تھا کہ معاملۂ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دے دے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کئے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی شریعت میں قانون ازدواج کی بناء ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام

مستحسن اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا تڑوانے کی کوشش کرنا سخت نامحمود ہے۔
اور جب یہ تعلق دونوں کے لئے، یا دونوں میں سے کسی ایک کے لئے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے، یا اس میں مودّت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہت داخل ہو جائے، تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے ماتحت شریعت نے معاملۂ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقد نکاح کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کی صورت میں حلِ عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدۂ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار کر دے تو پھر قاضی سے مدد لے۔

زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، اور خدا اور رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کر کے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ اگر مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جائے

تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کر دے وہ مجبور رہے کہ بہرحال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لئے محال ہی کیوں نہ ہو جائے اور منا کحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جسارت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟ یہ جسارت اگر کوئی کرے تو اسے اقوالِ فقہاء سے نہیں بلکہ کتاب و سنت سے اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے کہ اللہ اور رسول نے خلع کے معاملہ میں قاضی کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے۔

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات :-

قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ اس کو پھر پڑھیے

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔ (البقرہ - ۲۲۹)	اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ان دونوں (یعنی زوجین) پر اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت) کچھ فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

اس آیت میں خود زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں میں کیا گیا ہے لہذا الفاظ اِنْ خِفْتُمْ (اگر تم کو خوف ہو) کے مخاطب وہ نہیں ہو سکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں باہمی رضامندی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے۔

اس کی تائید اُن احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں خلع پر راضی نامہ نہ ہو سکے تو عورت کو قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اب اگر فی الواقع قاضی اس معاملہ میں صرف سماعت کا اختیار رکھتا ہو، مگر مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں اس سے اپنا فیصلہ منوا لینے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اوپر منقول ہوئے ہیں۔ ان سب میں یا تو صیغۂ امر آیا ہے جیسے طَلِّقْهَا (اسے طلاق دے) فَارِقْهَا (اس سے جدا ہو جا) اور خَلِّ سَبِيْلَهَا (اس کو چھوڑ دے) یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ اور ابن جریر نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا "پھر آپ نے ان کو جدا کر دیا۔" اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جمیلہ بنتِ اُبَیّ بن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ قاضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔

رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کر دے تو کیا قاضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں تو ایسی کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی

کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے سرتابی کی جرأت کی ہو۔
لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں، جس میں آپ
نے ایک ہیکڑ شوہر سے فرمایا تھا: لَسْتَ بِبَارِحٍ حَتّٰی تَرْضٰی بِمِثْلِ
مَا رَضِيَتْ بِہٖ یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک کہ تو بھی اسی طرح حکمین
کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر قاضی
ایک شوہر کو حکمین کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو
وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لئے تو بدرجۂ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا
ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف ایک خلع ہی کا
مسئلہ ایسا ہو جسے قاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں
میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر
اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کرا دے۔ پھر کیوں نہ خلع کے
مسئلہ میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ
واضح ہو جائے گی کہ عِنّین[1] اور مجبوب[2] اور خصی اور جذامی اور مبروص[3] اور مجنون
شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح
خیار بلوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کئے گئے ہیں،
ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خلع دلانے کے

---

[1] نامرد [2] مقطوع الذکر [3] کوڑھی

پورے اختیارات قاضی کو حاصل ہوں۔ ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں، ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں رہتی کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا خودکشی کر لیں، یا اپنے داعیاتِ نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرتد ہو کر قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں توضیح مدعا کے لئے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عنین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی۔ اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہم بستری پر قادر ہو گیا، حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت بھی کر لی[1] تو عورت کو فسخ نکاح کا حق نہیں ہے۔ بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لئے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح کے وقت معلوم تھا کہ وہ نامرد ہے اور پھر وہ نکاح پر راضی ہوئی تو اس کو سرے سے قاضی کے پاس دعویٰ ہی لے جانے کا حق نہیں[2]۔ اگر اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر نامرد ہو گیا تب بھی عورت کو دعوے کا حق نہیں[3]۔ اگر عورت کو

---

[1] فی رد المحتار عن المعراج اذا اولج الحشفۃ فقط فلیس بعنین وان کان مقطوعاً فلابد من ایلاج بقیۃ الذکر

[2] فی العالمکیریۃ ان علمت المرأۃ وقت النکاح انہ عنین لا یصل الی النساء لا یکون لہا حق الخصومۃ

[3] فی الدر المختار فلو جبّ بعد وصولہ الیہا مرۃ او صار عنیناً بعدہ ای الوصول لا یفرق لحصول حقہا بالوطی مرۃ

نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم حاصل ہوا اور وہ اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے تب بھی وہ ہمیشہ کے لئے خیار فسخ سے محروم ہو گئی[1] ۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو گیا۔ اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع کر لے۔ مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا۔ کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا مہر بلکہ مہر سے کچھ زائد لے کر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے اب غور کیجئے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہو گا؟ بس یہی نا کہ یا تو وہ خودکشی کر لے، یا عیسائی راہبات کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں برداشت کرے، یا قید نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو، یا پھر سرے سے دین اسلام ہی کو خیرباد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشا بھی یہی ہے کہ عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لئے قانونِ ازدواج بنایا گیا تھا؟ کیا ایسے زوجین میں مودّت و رحمت ہو گی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدّن کی کوئی مفید خدمت کر سکیں گے؟ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہو سکیں گے؟ کیا یہ قید نکاح کسی حیثیت سے بھی احصان کی تعریف میں آسکے گی اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا

---

[1] قال الشامی قولہ لم یبطل ای مالم تقل رضیتُ بالمقام معہ

تحفظ ہو گا؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہونے، یا دائرۂ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سر ہو گا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے قانون میں ایسا کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔

تقضائے شرعی:۔

طلاق اور خلع کی بحث میں قانونِ اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ان سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدۂ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودّت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریح باحسان ہونا چاہیئے۔ یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہو جائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے اختلاف سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو، بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں، سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو، اور آئندہ نسلوں تک اُن کے بُرے اثرات متعدی ہو جائیں۔ اِنہی خرابیوں کا سدِّباب کرنے کے لئے شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریح باحسان کے اصول پر عمل کر سکیں[۱]۔ لیکن بہت سی ایسی جھگڑالو

---

[۱] ۔ یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی شریعت میاں اور بیوی کے باہمی

طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کر سکتی ہیں اور نہ تسریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں، نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے، یا امساک بالمعروف اور تسریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیئے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیے اور حقوق اللہ کی حفاظت کے لئے مقرر کر دیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صہ ۷۹) جھگڑوں کا پبلک میں علانیہ بر سر عدالت آنا پسند نہیں کرتی۔ اس لئے اس نے عورت اور مرد دونوں کیلئے ایسے قانونی چارۂ کار رکھ دیئے ہیں کہ حتی الامکان گھر کے گھر ہی میں وہ اپنے جھگڑے نمٹالیں۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا بالکل آخری تدبیر ہے جب کہ گھر میں فیصلہ کر لینے کا کوئی امکان نہ ہو۔

قضاءِ شرعی کے متعلق چند اُصولی مباحث

قبل اس کے کہ اُن مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاءِ شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔

قضاء کے لئے اوّلین شرط

قضاءِ شرعی کی شرائط میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ عدالت لازمًا اسلامی عدالت ہونی چاہیئے اور قاضی کو لازمًا مسلمان ہونا چاہیئے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہاء نے بتصریح بیان کیا ہے۔ یعنی یہ کہ اصولِ شرع کے تحت شرعی معاملات میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہرًا نافذ ہو جائے مگر باطنًا نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکامِ شرعی کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہو گا اور نہ شرعًا عورت کے لئے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہو گا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہو گا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہو گی۔ رہی دوسری وجہ تو وہ یہ ہے کہ قرآن غیر اسلامی عدالت کے فیصلہ کو اوّل تو اصولاً تسلیم ہی نہیں کرتا۔ پھر مسلمانوں کے معاملہ میں خصوصًا اس کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ ان پر عدالتِ کفر کا حکم اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں ہے۔

اس مسئلہ کی پوری توضیح میں اپنے مضمون "ایک نہایت اہم استفسار" میں کرچکا ہوں، جو اس کتاب کے آخر میں بطورِ ضمیمہ لگا دیا گیا ہے۔

قضاء کے لیئے اجتہاد کی ضرورت

علاوہ بریں جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے، اگرچہ ان کے لیے شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں، لیکن شخصی معاملات میں ہر ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تنفیذ، اور اصولِ قانون سے حسبِ موقع جزئیات کا استنباط اور روحِ قانون کے مطابق فصلِ خصومات کے جملہ شرائط کا لحاظ، بغیر اس کے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوتِ اجتہاد ہو اور اس کے ساتھ اس کے دل میں اعتقاداً اُس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لیے وہ منصبِ قضاء پر مامور ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اُسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو مذہبا مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حادی ہو، اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کے اصل مآخذ پر دست رس رکھتا ہو اور مسلم سوسائٹی کے نظامِ ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی معاملات کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضاء شرعی نہ ہونے کے نقصانات[1]

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک

---

[1] یہاں پھر اس امر کی توضیح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اصولاً اس قضاء شرعی (باقی صفحہ ۸۳ پر)

مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصولِ شریعت کے مطابق جس چیز پر قضائے شرعی کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب قریب بالکلیہ مفقود ہو گئی۔ اور مسلمانوں کے لئے اپنے شرعی معاملات میں عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا ناممکن ہو گیا جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جا سکتا ہو۔ دوسرا نقصان جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں، یہ ہوا کہ ان عدالتوں کے حکام کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے قانونِ اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوتِ اجتہاد پیدا ہو جائے اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تأمل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے۔ مثلاً ہملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے

(بقیہ ص ۸۲) کی صحت کا معتقد نہیں ہوں جو غیر اسلامی حکومت کے اذن سے قائم ہو مگر اس جگہ بر سبیلِ تنزل وہ صورت بیان کرنا چاہتا ہوں جس سے اسلامی حکومت قائم ہونے تک ہندوستانی مسلمانوں کے شرعی معاملات بدرجۂ آخر درست ہو سکتے ہیں۔

اتنی ٹھوکریں کھاتے ہیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کئے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور بیلی (Baillie) جس کا ڈائجسٹ آف محمڈن لا (Digest of Muhammadan Law) فتاویٰ عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمہ سے ماخوذ ہے اور میکناٹن (Macnaughton) جس کی کتاب پرنسپلز آف محمڈن لا (Principles of Muhammadan Law) ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے دائرہ معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں۔ چنانچہ جسٹس مارکبی ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے۔

"شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں"[1]

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا، کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے اور نہ حکومت متسلطہ کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کر سکیں۔ ایک مقدمہ[2] کے فیصلہ میں چیف جسٹس گارتھ

---

[1] خواجہ حسین بنام شہزادی بیگم۔ [2] ملک عبدالغفور بنام ملیکا۔

نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔

"قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے "اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں، جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں "حتی الامکان احکام شرعِ اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں "، لیکن اول تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں تطبیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں۔ اس لیے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر کوئی حکم مبنی ہو اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور اختلافاتِ ائمہ میں تطبیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین میں اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جائز ٹھہراتا ہے اور اسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر

کرتے ہوئے کوئی تامّل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدّنی حالات اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا ایمان و علم کا نتیجہ ہے کہ جو اُدھورا اور ناقص قانون محمڈن لا، کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے، اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم:

پس معاملاتِ نکاح و طلاق اور دوسرے شرعی معاملات میں صحیح فیصلے حاصل کرنے کی کم سے کم اگر کوئی صورت اس وقت ممکن ہے تو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس ملک میں تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) حاصل ہو[1] اور اس کے تحت مسلمان اپنے معاملات کے تصفیہ کے لئے خود اپنے محاکمِ شرعیہ قائم کرنے کے مجاز ہوں۔ اور ان محکموں میں ایسے متقی علماء قاضی کی حیثیت سے مقرر کئے جائیں جو قانونِ شریعت میں فقیہانہ بصیرت رکھتے ہوں۔ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر حقیقت میں مسلمان کے لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہاں زندگی بسر کرنا محال ہے۔ اور اگر یہ چیز بھی انہیں

---

[1] اس مسئلہ پر مفصل بحث میں نے اپنی کتاب " " میں کی ہے۔

حاصل نہ ہو تو بر سبیل تنزل اتنا ہی سہی، اور یہ انتہائی مجبوری کی حالت میں آخری صورت ہے کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر حکومتِ متسلّطہ پر دباؤ ڈال کر اس سے یہ منوا لیا جائے کہ مسلمانوں کے معاملاتِ نکاح وطلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی، اور انگریزی عدالتوں میں ان کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی، اور خود انگریزی عدالتوں میں جو مقدمات نکاح وطلاق وغیرہ پیش ہوں گے ان کو بھی پنچائتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا[1]۔ برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان مسلمان ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کر کے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاحِ معاملات کے لیے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیئے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچائتی سسٹم قائم کر کے اس کو ان ریاستوں سے تسلیم کرا لیا جائے۔ اگر یہ نہ کیا گیا تو مجالس وضع قوانین میں کسی مسودۂ قانون کو پیش اور

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضاءِ قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہ پنچائتیں اپنے فیصلے نافذ کرنے کا اقتدار رکھتی ہوں اور ان کے اختیاراتِ سماعت محض ثالثانہ نہیں بلکہ حاکمانہ نوعیت کے ہوں تو مذہبِ حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضاءِ شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

پاس کرالینا اسلامی اغراض کے لئے ہرگز سودمند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعہ قوانین کی ضرورت

انتظامِ قضائے شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے۔ اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات سے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے تاکہ محاکمِ شرعیہ یا پنچایتوں میں موجودہ انگریزی محمڈن لار کی جگہ اس کو رواج دیا جاسکے۔ مصر میں جب مخلوط عدالتیں (Mixed Tribunals) قائم کئے گئے تھے، تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعۂ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند ماخذ سے تمام ضروری قوانین یکجا مرتب کر دیئے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومتِ مصر کے ایماء سے قدری پاشا کی صدارت میں علماء ازہر کی مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور مجلس کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے عدالتوں میں رائج کیا گیا[1]۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے چیدہ چیدہ علماء چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصّل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں۔ اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودے کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علماء

---

[1] اس مجموعہ کا ترجمہ فرنچ زبان میں (Droit Mussalman) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور مصر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی اس کو عدالتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کی رائے دریافت کی جائے۔ پھر ان آراء اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو اسے احکامِ شرعیہ کا مستند مجموعہ قرار دے کر یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کی طرف رجوع کیا جائے گا اور انگریزی عدالتوں کے نظائر اور غیر اہلِ علم و ایمان ججوں کی تشریحات سے جو محمڈن لا تیار ہوا ہے، وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہماری کتبِ فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں ہے بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرور مخالفت کی جائے گی۔ اس لئے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرزِ بیان و اندازِ ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں، اور ایسی زبان میں ہیں جس کی اصطلاحی باریکیوں کو اب عموماً وہ لوگ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے جو ان کتابوں کا درس دیتے ہیں۔ آج کل قانون کی کتابوں میں جس طرح احکام کو دفعہ وار بیان کیا جاتا ہے اور پھر ہر دفعہ کے نیچے اس کے خاص خاص الفاظ کی تشریح، اس کے مقصد کی توضیح، اس کے تحت آنے والے جزئیات کی تفصیل دی جاتی ہے، اور معتبر حکام کے نظائر اور مختلف ماہرین کی تعبیرات جس طرح منقح صورت میں درج کی جاتی ہیں، اور فہرستوں اور انڈکسوں سے مسائل کے تلاش کرنے میں جو آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں،

ان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار نہ کرے گا کہ انسانی کوششوں سے تدوین و ترتیب کے فن میں یہ جو ترقی ہوئی ہے اس سے کتب فقہیہ کی تدوین جدید میں ضرور کام لیا جانا چاہیئے۔ آخر قدیم طرز تدوین کوئی منصوص اور مشروع طرز تو نہ تھا کہ اس کی پابندی لازم اور اس سے تجاوز گناہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفیذ موقوف ہے اس پر کہ:

اولاً جس اسلامی معاشرے میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کے اخلاقی، تمدنی معاشرتی اور معاشی حالات کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں، وہ کس ماحول میں رہتے ہیں، اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں، ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے۔ فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات، اور ان کے طبقہ کی عام حالت، سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے

جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے اور اصولِ قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو، چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہو گی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے الگ الگ مزاج اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کیے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی، مگر وہ اس لیے کب مرتب کیے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں۔ انہیں استعمال کرنے کے لئے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمہ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کیے ہیں وہ بھی اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو اُن بزرگوں کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ ہو گی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقُّہ اور تدبُّر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا، جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپراسی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے تحت کسی مرد یا عورت کا مجبوراً بداخلاقی میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجبِ فتنہ و فساد بن جانا قریب قریب محال تھا۔ اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرۂ اسلام سے نکل جائے۔ لیکن آج ہم

دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد
حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر مقدمات
میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لیے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال
ہو گیا ہے۔ تفقّہ اور تدبّر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں۔ ان میں سے
کوئی بھی نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک، جس سوسائٹی اور جس خاص موقع
میں نافذ کر رہے ہیں، اس کی کون کون سی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس حکم کے عموم
میں اصولِ شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ شریعت کے
مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے، اور اس کے اصول میں سے کسی
اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکامِ عدالت کا تعلق ہے، ان کی
معذوری تو ظاہر ہے۔ رہے علماء، تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد
ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے
ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک اُسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں اور بعض کو اگرچہ
اللہ تعالیٰ نے وسعتِ نظر اور تفقّہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے لیکن فرداً فرداً ان
میں سے کسی میں بھی ایسی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقّہ سے کام لے کر کسی قدیم
جزئیہ کی عبارت سے بال برابر بھی انحراف کر جائیں۔ کیونکہ ایک طرف خود انہیں
اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری
طرف یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ دوسرے علماء کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت
کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبہ کے جلیل القدر
اور با اثر علماء کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت اثر

سے کام لے کر شرعی معاملات کے لئے ایسا ضابطہ مرتب کرے جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ اخلاقی، تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو۔ اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جا سکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو غیر مقلدیت قرار دیتا ہے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیئے۔ اسے اتنا وقوف بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلہ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلہ نبی اور اس کے مسائل کو نصوصِ کتاب اللہ کی طرح اٹل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھال جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح، ترمیم اور اضافہ تو در کنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہِ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اُس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا، مگر اس کے بعد حرام ہو گیا ہے لیکن اس طرح کی تقلید علماء سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لئے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے۔ علماء احناف نے امام اعظم رح اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک

کر کے بعض کو مفتی بہ قرار دیا۔ مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علمائِ احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتے رہے اور حسبِ ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے مذاہب سے مسائل اخذ کر کے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے۔ مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابو اللیث سمرقندی، شمس الائمہ سرخسی، صاحب ہدایہ، قاضی خاں، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو محض اس بناء پر غیر مقلد کہہ دے کہ انہوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی، اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا، ان میں دوسرے مذاہبِ فقہیہ کے مطابق فتویٰ دیا، اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کر لیا کہ بوقتِ ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتویٰ دینا جائز ہے، بشرطیکہ اس میں اتباعِ ہوی[1] نہ ہو۔

اس میں شک نہیں اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے خواہشات کی پیروی، مختلف مذاہب نے اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے جو رخصتیں خاص خاص حالات میں دی ہیں اُن سے نفع

---

[1] خواہشِ نفس کی پیروی

گیری، اور دین کے ساتھ مذاق کا دروازہ کھل جائے گا، اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گی۔ لیکن اگر علمارِ دین، تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کر کے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوصِ صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا اجر ان کو دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کو اختیار نہ کرنے میں ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانونِ اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور اس سے تلاعُب بالدین[1] اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دین و اخلاق کی خرابی اور کفر و معصیت کی وبائیں پھیلیں گی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کر لیں گے[2] تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی

---

[1] دین کا مذاق بنانا اور مسائلِ دین سے کھیلنا

[2] جیسا کہ وہ ترکی میں کر چکے ہیں۔

لیے تھی کہ تم اس کو بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا۔ تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لیے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی۔ اس کے بعد ہم اپنے اصل مبحث کی طرف رجوع کریں گے۔

اصولی ہدایات

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے۔ اس لیے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس میں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور جزئیات کے استنباط میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (بقرہ۔ ۲۲۱) — مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا۔ (بقرہ ۲۲۱) — مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (المائدہ۔ ۵) — اور حلال کی گئیں تمہارے لئے اہلِ کتاب میں سے وہ عورتیں جو محفوظ ہوں۔

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا، البتہ اہلِ کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آسکتی ہے نہ اہلِ کتاب کے۔

(۲) وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ ...... مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو......

وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ ...... مشرک مردوں سے اپنی عورتوں کے نکاح نہ کرو۔

(البقرہ - ۲۲۱)

اس سے یہ قاعدہ بھی معلوم ہوا کہ مرد تو اپنا نکاح خود کر لینے کا مختار ہے۔ لیکن عورت اس معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے اسے کسی کے نکاح میں دینا اس کے اولیاء کا کام ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث الایم احق بنفسھا من ولیھا اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے، اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف اس کا نکاح کر دینے کا حق حاصل نہیں مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی پسند اور خواہش کافی نہ ہو بلکہ ساتھ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِيۡضَةً — پس جو فائدہ تم نے ان سے اٹھایا ہے اس کے بدلے ان کے مہر ادا کرو۔ ایک فریضے کے طور پر۔

(النساء - ۲۴)

وَكَيۡفَ تَاۡخُذُوۡنَهٗ وَقَدۡ اَفۡضٰى بَعۡضُكُمۡ اِلٰى بَعۡضٍ۔ — اور تم اپنا دیا ہوا مہر ان سے کیسے چھین لوگے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے۔

(النساء - ۲۱)

وَاِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ — اور اگر تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے اور مہر مقرر ہو چکنے کے بعد ان کو طلاق دی ہو تو

فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ — اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔
(بقرہ - ۲۳۷)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اُس فائدہ کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت سے حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا اِلّا یہ کہ عورت یا تو اپنی خوشی سے پورا مہر یا اس کا کوئی حصّہ معاف کر دے۔ (فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ)

(۴) وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا — اور اگر تم نے ان کو مہر میں ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔
(النساء - ۲۰)

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ — مرد عورتوں پر قوّام ہیں۔ اس وجہ سے کہ ان میں سے ایک کو دوسرے پر اللہ نے فضیلت دی ہے اور اس لیے کہ وہ ان پر اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔
(النساء - ۳۴)

اس آیت کی رُو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ اُن حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتۂ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق

کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز (سرکشی) کی مرتکب ہو۔

(۶) لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۔ (الطلاق ۔۷)

خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے اور جس کا رزق نپا تلا ہو اسے اللہ نے جتنا کچھ دیا ہو اسی میں سے وہ خرچ کرے۔

یہاں نفقہ کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کے تعین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائے گا۔ مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے۔ اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق ہے۔

(۷) وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا (النساء ۔۳۴)

اور جن بیویوں سے تم کو سرکشی کا اندیشہ ہو ان کو نصیحت کرو، اور خواب گاہوں میں ان سے الگ رہو اور ان کو مارو پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو ان پر زیادتی کرنے کے لئے بہانے نہ ڈھونڈو۔

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدمِ اطاعت کی روش اختیار کرے اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت دوسرے ضرب غیر مُبرح ۔ یعنی ہلکی مار جو صرف انتہا درجہ کے نشوز میں جائز ہے اس حد سے تجاوز کرنا، یعنی بغیر سرکشی کے سزا دینا، یا کم درجہ کی سرکشی پر انتہائی سزا دینا یا انتہائی سرکشی پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا

(النساء - ۳۵)

اور اگر تم لوگوں کو اندیشہ ہو میاں اور بیوی کے درمیان ناچاقی کا تو ایک پنچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بھیجو۔ اگر وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو تو بر سر عدالت ان کے جھگڑے نمٹائے جانے سے پہلے یہ تدبیر کر لینی چاہیئے کہ ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے اور دونوں مل کر ان کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے کی کوشش کریں۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوْا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اس لیے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار بھی اولی الامر ہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ۔

(البقرہ - ۲۲۹)

پھر اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں میاں بیوی حدود اللہ کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت فدیہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت

قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ پر قائم رہ سکیں گے یا نہیں۔ اگر ظنِ غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم شے اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے اور اس کے لئے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جا سکتی ہے۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۔

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (البقرہ ۔ ۲۳۱) — اور ان کو ضرار کی خاطر نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو۔

اس آیت میں قانونِ اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بندِ نکاح میں اس طرح نہ روکی جائے کہ اس کے لئے موجبِ ضرر اور وجہِ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے۔ (فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ) مگر جہاں اس کی کوئی اُمید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ حسبِ ارشادِ نبوی، اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے۔ لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِي الْإِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (النساء ۔ ۱۲۹) — پس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا لٹکتا چھوڑ دو۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لئے نازل ہوئی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدے کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتۂ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے۔ یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ (البقرہ ۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیویوں سے اجتناب کی قسم کھا بیٹھیں ان کیلیے چار مہینے کی مہلت ہے۔

اس آیت میں عورت کی اوسط قوتِ برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یعنی چار مہینہ تک وہ فتنہ اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جا سکتی ہے[1]۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ (الآیہ ۔ النور ۔ ۶)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر

---

[1] اسی قاعدہ کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ کوئی شادی شدہ شخص مسلسل چار مہینے سے زیادہ مدت تک فوجی خدمت پر گھر سے دور نہ رکھا جائے۔

اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائے گا کہ وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کر دی جائے۔

(۱۴) اِلَّآ اَنۡ يَّعۡفُوۡنَ اَوۡ يَعۡفُوَا الَّذِىۡ بِيَدِهٖ عُقۡدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ۔ ۲۳۷) — الّا یہ کہ بیویاں مہر معاف کر دیں یا عفو سے کام لے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عُقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے اور وہی باندھے رکھنے یا کھول دینے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ مثلاً اِنۡ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنۡ طَلَّقَهَا۔ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ

ذٰلِكَ أَمْرًا (الطلاق - ۱) لہٰذا جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بناتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (البقرہ - ۲۷۹) نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبے میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے اور مرد کا حقِ طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، اگر اس کی شکایت جائز ثابت ہو گی تو قانون کو نافذ کرنے والوں، یعنی اولی الامر کو حق ہو گا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ[1] اور تفریق[2] اور تطلیق[3] کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں تو آدمی کا حقِ حیات تک اِلَّا بِالْحَقِّ کے ساتھ مشروط ہے کجا کہ اس کے حق طلاق کو ایسا مطلق

---

[1] نکاح توڑ دینا

[2] میاں بیوی کو جدا جدا کر دینا

[3] طلاق کا اختیار شوہر سے سلب کر کے باختیار خود عورت کو طلاق دے دینا۔

مانا جائے کہ خواہ وہ ظلم کرے، اللہ کی ساری حدیں توڑ دے، اور دوسرے فریق کے سارے حقوق ضائع کر دے، پھر بھی اس کا یہ حق بلاقید و شرط ہی برقرار ہے۔

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ	اطلاق دو بار ہے۔ پھر یا روک رکھا جائے
فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ	بھلے طریقے سے یا رخصت کر دیا جائے
بِاِحْسَانٍ۔ (بقرہ۔ ۲۲۹)	احسان کے ساتھ
فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ	پھر اگر مرد اس کو (تیسری بار) طلاق دیدے
بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ	تو وہ اس کیلئے حلال نہ ہوگی۔ جب تک کہ
(البقرہ۔ ۲۳۰)	اس کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو۔

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی مغلظہ۔

مسائلِ جُزئیّہ

پچھلے باب میں اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم اُن جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان میں سے ایک ایک اصل کے تحت آتے ہیں۔ یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصار کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جن میں ضروریات وحالاتِ زمانہ کے لحاظ سے از سرِ نو احکامِ فقہی کی تصریح و توضیح ضروری ہے۔

۱۔ اِرتدادِ احدالزّوجین

موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہو گئی ہے۔ بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لئے مرتد ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے یعنی اِذَا ارْتَدَّ اَحَدُ الزَّوْجَیْنِ وَقَعَتِ الْفُرْقَۃُ بِغَیْرِ طَلَاقٍ۔ جب زوجین

میں سے کوئی مرتد ہو جائے تو فرقت بغیر طلاق واقع ہو جاتی ہے[1]۔ لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی رُو کو روکنے کے لئے مشائخ بلخ و سمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے۔ اس فتوے کی بنا اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لئے مرتد بن جاتی ہے اس لئے اس حیلے کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید ان علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی۔

اولاً اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی۔ بلکہ صرف اس نیت سے مرتد ہوتی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہو جائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجۂ آخر وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے فائدہ اٹھا کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے۔ مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہو جائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے اس کا مسلمان مرد کے نکاح میں رہنا

---

[1] مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر تو حرام ہو جاتی ہے۔ مگر اس فرقت سے اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دُوسرا نکاح کر سکے۔

تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً جو عورت اسلام کے دائرے سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہو سکتا ہے۔ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور حکومت کی نگاہ میں مسلمان، ہندو، سکھ یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہو چکی ہے، اس کی مرضی کے خلاف اُسی نکاح پر قائم رہنے کے لئے مجبور کرے گی جو اُس سے بحالتِ اسلام اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بناء پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلے میں مشائخ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علماء کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فیصدی ایسی ہوں گی جن کے عقیدے میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لئے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے۔ مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بے ہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں، مگر بندِ نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت

عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ اِدھر اُدھر سے فقہی جزئیات نکال نکال کر لائے جائیں تاکہ ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لئے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کے آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام تک کا تعلق ہے، ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لئے موجب ضرر ہی ہو کجا کہ موجبِ ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی ہے، اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ خیارِ بلوغ

قرآن مجید میں اگرچہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیئے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدے کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بالکل ہی بے اختیار ہے۔ بخلاف اس کے حضورؐ نے ایجاباً عورت کو یہ حق

دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے ۔ چنانچہ ابوداؤد، نسائی،
ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباسؓ سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی
نے حضورؐ سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کےخلاف میری شادی کردی ہے۔
آپؐ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے ۔ نسائی میں خنساء بنت خدام کی
روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کردیا تھا۔ حضورؐ
نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی
ایک مقدمہ میں حضورؐ نے محض اس بناء پر زوجین میں تفریق کرادی کہ نکاح لڑکی کی
مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ
سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا
نکاح کردیا ہے ۔ حضورؐ نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کردے
اس پر اس نے عرض کیا۔

یارسول اللہ اجزت ما صنع ابی و انما اردت ان اعلم النساء ان لیس الی الآباء من الامر شیئ ۔	یارسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا ہے اسے میں نے منظور کیا۔ میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم۔ ابوداؤد ۔ ترمذی ۔ نسائی اور موطا میں حضورؐ کا ارشاد ہے ۔

الایم[1] احق بنفسھا من	شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے بڑھ کر

---

[1] لغت میں اَیِّم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔ مگر یہاں اس سے ثیبہ مراد لی گئی ہے ۔

والبکر تستاذن فی نفسہا۔

اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

لا تنکح الایم حتیٰ تستامر ولا تنکح البکر حتیٰ تستاذن۔

شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لے لی جائے اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا اذن نہ لے لیا جائے۔

۳۔ ولایتِ اجبار

اوپر جو روایات نقل کی گئی ہیں، وہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لئے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا کوئی ولی کر دے تو کیا اس صورت میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو۔ ساقط ہو جائے گا؟ اس مسئلے میں ہمارے فقہا نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہو گا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے۔ لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہو گا۔ اِلّا یہ کہ باپ دادا کا سیئ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ وہ فاسق یا بے حیا ہے۔ یا اپنے معاملات میں سوءِ تدبیر اور

ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہے۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر جابرانہ حق حاصل ہے، اور ان کے کیے ہوئے نکاح کو لڑکی بالغ ہونے پر نامنظور نہیں کر سکتی، قرآن مجید کی کسی آیت، یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں[1]، بلکہ محض فقہا کے اس قیاس پر مبنی

---

[1] مبسوط میں امام سرخسیؒ نے لے دے کر صرف ایک حجت پیش کی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضؓ کا نکاح بحالت نابالغی کیا تھا۔ پھر جب حضرت عائشہ رضؓ بالغ ہوئیں تو حضورؐ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ تمہیں اس نکاح کے قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار ہے، حالانکہ اگر نابالغہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا تو جس طرح قرآن مجید کی آیت تخییر نازل ہونے پر آپؐ نے ان کو اختیار دیا تھا اسی طرح اس معاملے میں بھی ضرور اختیار دیتے (المبسوط ج ۴ ص ۲۱۳)

اس سے معلوم ہوا کہ ولایت اجبار کے حق میں بڑی تلاش کے بعد بھی اس کمزور دلیل کے سوا کوئی دلیل کتاب و سنت سے نہیں لائی جا سکی ہے۔ اور یہ دلیل اتنی کمزور ہے کہ ہمیں شمس الائمہ سرخسی جیسے شخص پر حیرت ہے کہ انہوں نے کس طرح اتنے بڑے ایک اہم مسئلے کی، جس کا اثر بے شمار عورتوں سے ہمیشہ کے لیے ایک حق مسلوب ہو جانے کی شکل میں مترتب ہوتا ہے، اس دلیل پر بنا رکھنے کو درست سمجھا۔ یہ کہنا کہ اس حدیث کی رُو سے باپ کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہیں ہے، اگر صحیح ہو سکتا تھا تو اُس صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ حضرت عائشہ رضؓ نے بالغ ہو کر اپنے والد کے کیے ہوئے نکاح کو نامنظور کیا ہوتا۔ یا اس کے مقابلہ میں خیار بلوغ (باقی صفحہ ۱۱۴ پر)

ہے کہ باپ دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہوسکتے۔ اسلیے لڑکی پر ان کا کیا ہوا نکاح

(بقیہ حاشیہ صــــ۱۱۳) استعمال کرنے کا حق مانگا ہوتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ جواب دیا ہوتا کہ نہیں، اب تمہیں یہ حق نہیں رہا، کیونکہ تمہارا نکاح نابالغی کے زمانے میں تمہارے والد نے کیا تھا۔ لیکن ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے۔ بلکہ کسی روایت میں یہ تک مذکور نہیں ہے کہ حضرت عائشہ رضہ نے بالفاظ صریح یہ کہا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اِس معاملے میں کوئی اختیار نہیں دیا۔ سارے استدلال کی بنیاد صرف اِتنی سی بات پر رکھی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عائشہ رضہ کو خیار دینا چونکہ کسی روایت میں نہیں بیان ہوا ہے لہذا یہ فرض کیا جائے گا کہ آپ نے ان کو خیار نہیں دیا، اور چونکہ آپ نے ان کو خیار نہیں دیا لہذا ہم اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایسی لڑکی کو خیار کا حق حاصل ہی نہیں ہے۔

اس بودی دلیل کو پیش کرتے وقت شمس الائمہ کو نہ تو یہ یاد رہا کہ کسی واقعہ کا روایات میں مذکور نہ ہونا اس واقعہ کے پیش نہ آنے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اور نہ انہیں یہی خیال آیا کہ جو لڑکی بالغ ہونے کے بعد اپنے باپ کے فعل پر راضی تھی، جس نے اس پر کسی نارضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا جس نے باپ کے مقابلہ میں خیارِ بلوغ استعمال کرنے کا سرے سے مطالبہ ہی نہیں کیا تھا، اگر اسے خیار نہیں دیا گیا تو آخر یہ اس بات کی دلیل کب بن سکتا ہے کہ باپ کے مقابلہ میں لڑکی کو خیار بلوغ سرے سے حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسی دلیلوں سے اگر حقوق سلب ہونے لگیں تو ایک شخص یوں بھی استدلال کر سکتا ہے کہ چونکہ فلاں موقع پر فلاں شخص کو (جس نے پانی سرے سے مانگا ہی نہ تھا) پانی نہیں دیا گیا، اس لیے (باقی صــــ۱۱۵ پر)

لازم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

فَلَا خِیَارَ لَهُمَا بَعْدَ بُلُوغِهِمَا لِاَنَّهُمَا كَامِلَا الرَّأْيِ وَافِرَا الشَّفَقَةِ فَيَلْزَمُ الْعَقْدُ بِمُبَاشَرَتِهِمَا كَمَا اِذَا بَاشَرَاهُ بِرِضَاهُمَا بَعْدَ الْبُلُوغِ۔

لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً وعقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔

اولاً حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کمسنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے ردّ یا

(بقیہ حاشیہ صلالا) کسی کو یا نی نہیں دیا جانا چاہیئے۔

اس سے بھی عجیب تر شمس الائمہ کا یہ استدلال ہے کہ اگر لڑکی کو باپ کے مقابلے میں خیارِ بلوغ حاصل ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضؓ کی طلب کے بغیر بھی ان کو یہ خیار ضرور دیتے۔ کیونکہ آیت تخییر کے نزول کے بعد آپؐ نے ان کو خیار عطا کیا۔

دوسرے الفاظ میں شمس الائمہ کا استدلال یہ ہے کہ جو کام ایک معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا صریح حکم آنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہی کام ایک دوسرے معاملے میں بھی آپ ضرور کرتے درآنحالیکہ اس معاملے میں اللہ نے آپؐ کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔

علماء کرام چاہتے ہیں کہ ایسی کمزور باتیں محض اس دھونس کی وجہ سے آنکھیں بند کر کے مان لی جائیں کہ جو انہیں نہ مانے گا اس پر غیر مقلدیت کا ٹھپا لگا دیا جائے گا۔

قبول کرنے کا اختیار ہے۔ اس حدیث سے نابالغہ کے لئے خیارِ بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ میں چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں، اس لیے میرا کیا ہُوا نکاح اس کے لئے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو، لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا حق کلیتہً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملۂ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھ کر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے اگر کسی کے "کامل الرائے اور وافر الشفقت" ہونے کی بنا پر اس کو ولایتِ اجبار حاصل ہو سکتی ہے تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیئے جس طرح عدمِ بلوغ کی حالت میں اس کے لئے ثابت کی جاتی ہے۔ لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایتِ اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟

ثالثاً، باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھ کر ایک قیاس قائم کر لیا گیا ہے۔ مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں، جن سے وفورِ شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر ملتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفورِ شفقت اور کمالِ رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کمسن لڑکے سے کر دیں، اور لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کیخلاف نالائق نکلے خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے،

تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں، اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کمسنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بُری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس وقت باپ دادا کی ولایتِ اجبار خود ان کے لئے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامسًا، اگر باپ دادا سَیِّئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیارِ بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو بر سرِ عدالت اپنے باپ دادا کے خلاف بدنیتی، فسق و فجور، بے حیائی، سوءِ تدبیر اور حماقت و بلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔ اور یہ اس کے لئے نہ صرف مشکل ہے بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے اور مصالح کا تقاضا یہ ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیارِ بلوغ دیا جائے۔[1]

---

[1] ۔ ہم نے نابالغ لڑکے کا مسئلہ یہاں اس لئے نہیں چھیڑا کہ اسے پھر بھی طلاق کا چارۂ کار حاصل ہے۔

۴۔ خیارِ بلوغ کی شرائط

اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محلِ نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں ان کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرۂ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیارِ بلوغ استعمال کر سکتی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر پہلے حیض کا خون نمودار ہوتے ہی اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ لطف یہ ہے کہ یہ شرط صرف باکرہ کے لئے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ[1] اور نابالغ لڑکے کے لیئے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں ان کو خیارِ فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرۂ نابالغہ کے لئے رکھی گئی ہے، اس کا ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیارِ فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر انسان میں بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ عقلِ رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب

---

[1] شوہر دیدہ عورت۔ اگر کوئی لڑکی بالغ ہونے سے پہلے مرد کی صحبت سے آشنا ہو چکی ہو، خواہ بصورت نکاح یا بصورت زنا، تو وہ بھی ثیبہ ہی کہی جائے گی۔

رونما ہو جاتا ہو اور آنا فانا اس میں رائے قائم کرنے کی صلاحیتیں اُبھر آئی ہوں۔ تاہم مان لیا جائے کہ ایسا ہوتا ہے تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اُس وقت تک کے لئے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کر دیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ آخر باکرہ ہی کو کیوں سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لئے کافی وقت نہ دیا جاتے؟ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

۵۔ مہر

مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول ؐ کے قانون میں اس کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لئے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی۔ مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْـًٔا[1] کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

امراۃٌ اصابت ورجل اخطأ ۔ ایک عورت نے صحیح بات کہی اور مرد غلطی کر گیا۔

---

[1] اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر سا مال بھی دیا ہو تو اس میں سے تم کچھ واپس نہ لو۔

پس جہاں تک مہر کی تحدید کا تعلق ہے قانون میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں لیکن احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔

الزموا النساء الرجال ولا — عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش

تغالوا فی المهور — کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپؐ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراهم من اودیتکم مازدتم۔ "اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے۔" حضرت انس رضؓ نے ایک عورت سے چار اَوقیہ (۱۶۰) درہم پر نکاح کیا تو حضورؐ نے فرمایا۔ تنحتون الفضة من عرض هذا الجبل۔ "گویا کہ تم اس پہاڑ میں سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو۔ اگر یہ دنیا میں کوئی قابلِ عزت اور آخرت میں تقویٰ کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے۔ مگر آپؐ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر بھی بارہ اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی رقمیں مہر موجّل کے طور پر لکھ دی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں

کہ کبھی ان کو یہ مہر ادا کرنا ہے - یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لئے موجب فساد ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتصریح فرمایا ہے کہ:-

من تزوج امرأة بصداق ینوی ان لا یؤدیه فهو زان ومن ادان دینا ینوی ان لا یقضیه فهو سارق -	جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کرے گا وہ دراصل زانی ہے اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے [1]

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے - رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں - اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ

---

[1] اس حدیث سے مہر کے معاملہ کی جس اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے، ظاہر ہے - اس بناء پر میں ایسے تمام لوگوں کو جن کے مہر عام رسم کے مطابق ان کی مالی استطاعت سے بہت زیادہ باندھے گئے ہوں، یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اپنی بیویوں کو مہر میں اس حد تک کمی قبول کرنے پر راضی کریں جسے وہ یک مشت یا بالاقساط ادا کر سکتے ہوں! اور نیک بیویوں کو بھی میں مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کمی پر راضی ہو جائیں - نیز ہر خدا ترس مسلمان کو بار مہر سے سبکدوش ہونے میں حتی الامکان جلدی کرنی چاہیئے - مہر ایک قسم کا قرض ہے اور اپنے ذمہ جان بوجھ کر یا بے پروائی کے ساتھ قرض چھوڑ کر مر جانا اتنی بری بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا ہے -

دے سکے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لئے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لئے وہ غریب معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے، ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب ۵۰ فیصدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لئے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ مہر اگر معجّل[1] ہو تو فریقین مختار ہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں۔ لیکن اگر وہ مؤجّل[2] ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور زرِ مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخال دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے تو مہر مؤجّل کا یہ سر تا پا عیب طریقہ بآسانی مسدود ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر

---

[1] جو فوراً ادا کیا جائے۔

[2] جو ایک مدت کے بعد ادا کیا جاتا ہو۔

دیں۔ حالات کے درباصلاح ہو جانے پر یہ شرط اڑائی جا سکتی ہے۔

۶ - نفقہ

اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی تو استطاعت رکھتا ہو، مگر نہ دے، اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مجبور کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطورِ خود اپنے نفقہ کا انتظام کرے۔ خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر، خواہ محنت مزدوری کر کے خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔ بخلاف اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطورِ خود طلاق واقع کر دینے کا حق ہے۔ بعض علمائے احناف نے مالکیہ کے اس فتوے کو اختیار کرنا پسند کیا ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت خود نفقہ کا انتظام نہ کر سکتی ہو۔ یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہو۔ لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی۔ قرآن مجید کی رُو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معاوضہ ہی میں اس پر شوہر کو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے انکار کر رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقدِ نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے۔ چیز لے کر اس کا بدل اور مال لے کر اس کی قیمت ادا کرنے سے جو شخص انکار

کر دے وہ آخر اس جہیز اور اس مال کا مستحق کیسے رہ سکتا ہے؟ جب تک عورت کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت میں اس کو خود روزی کمانے، یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے، یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصولِ قرض کی غیر ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف آخر کس اصولِ انصاف کی بناء پر دی جاتی ہے؟

دوسری صورت میں پھر حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی جائے گی اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اُس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ بن بیاہی ہوتی۔ لیکن امام مالکؒ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعویٰ کرے تو تفریق کرادی جائے گی۔ امام مالک کی رائے میں شوہر کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی مہلت دیتے ہیں اور امام احمد کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرادی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ میں بیان کیا گیا ہے، ائمہ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرادی جائے۔ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے

سعید بن مسیبؒ کا بھی یہی فتویٰ ہے اور حضرت عمرؒ ابن عبدالعزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔

بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (الطلاق-۱) "جس کو نپا تلا رزق دیا گیا ہو اس کو اپنی اسی استطاعت کے مطابق نفقہ دینا چاہیئے جو اللہ نے اُسے دی ہے۔ اللہ کسی متنفس کو اس سے زیادہ کی تکلیف نہیں دیتا جس کی قدرت اس نے اسے عطا کی ہو" لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لئے شرعًا کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لئے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت مصیبت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے۔ اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے، تو نہایت قابلِ تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانونِ اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے بلند مقام پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلے میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب

امام مالک کا ہے، جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

۷۔ ستمِ ناروا

آیتِ کریمہ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا۔ (النساء-۳۴)

کی رُو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزارِ جسمانی ہو یا آزارِ لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے۔ اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانونِ اسلامی کے اصول میں اس کی گنجائش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت اور ناقابلِ برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جا سکتا ہے آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کرنے کا عام رواج ہو گیا ہے۔ شوہریت کے معنی یہ سمجھے جا رہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود لائسنس ہے اس لئے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیئے کہ مار پیٹ اور گالم گلوچ کی عادت کو خُلع کے جائز اسباب میں شمار کیا جائے اور ایسی عورتوں کو بلا معاوضہ خلع دلوایا جائے جن کے شوہروں کی اس عادت کا ثبوت بہم پہنچ جائے۔

۸۔ تحکیم

اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ کشف الغمہ میں ہے کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حَکَم تجویز کریں پھر دونوں حکموں کو مخاطب کر کے فرمایا "تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملادو اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کردو۔" پھر عورت سے دریافت فرمایا کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے؟ اس نے عرض کیا "ہاں میں راضی ہوں" اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا، اس نے کہا "اگر وہ ملادیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں"۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ کَیْسَ ذَالِکَ لَکَ لست ببارح حتٰی ترضی بمثل مَارضیت بِہٖ۔ "تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی رضامندی کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو، تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں ایسی چند دفعات کا اضافہ کیا جائے جن میں تحکیم کے طریقے اور حَکَم کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریقِ نفاذ، اور اختلاف کی صورت میں عدالت کے طریقِ کار کی صراحت کردی جائے۔ اسلامی قانون میں یہ ایک بڑی قیمتی چیز

ہے کہ خانگی جھگڑوں کو حتی الامکان کھلی عدالت میں لانے سے پرہیز کیا جائے، اور اگر عدالتوں میں ایسے معاملات آئیں بھی تو حاکمِ عدالت ان کی تحقیق اور ان کا فیصلہ کرنے سے پہلے دونوں خاندانوں کے ذمہ دار افراد سے اس گتھی کے سلجھانے میں مدد لے۔ اس تجویز کو معاشرتی زندگی کے لیئے ایک رحمت سمجھنا چاہیئے۔

۹۔ عیوب میں خیارِ فسخ[1]

عیُوبِ زوجین کے مسئلہ میں فقہا کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں۔

ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بناء پر دوسرے فریق کو خیارِ فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے وَلَا یتخیر احد الزوجین بعیب الآخر ولو فاحشا کجنون وجذام وبرص ورتق وقرن "میاں بیوی میں سے کسی کو بھی دوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو۔ مثلاً جنون۔ جذام۔ برص۔ رتق اور قرن"۔ صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعود اور ائمۂ مجتہدین میں سے عطاء، نخعی، عمر ابن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ اوزاعی، ثوری، ابوحنیفہ، اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ، اور شرم گاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے۔

---

[1] خیارِ فسخ، یعنی نکاح ہو جانے کے بعد یہ کہنے کا اختیار کہ مجھے یہ نکاح قبول نہیں ہے۔

چنانچہ ابن جزی نے القوانین میں عیوب مذکورہ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا کان فِي أَحَدِ الزَّوجَينِ احدُ العُيُوبِ كان الأخر الخيار في البقاء معه و الفراق ؛" اگر ان عیوب میں سے کوئی عیب عورت یا مرد میں ہو تو فریق ثانی کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ رہنا قبول کرے یا الگ ہو جائے۔"

امام شافعی کے نزدیک جنون اور جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیارِ فسخ ہے۔ مگر قروحِ سیالۂ فرج[1]، مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارش میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت اندامِ نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو، جو مانع مباشرت ہوں، یا مرد عنین، یا مقطوع الذکر ہو، تو ایسی صورت میں فریق ثانی کو خیارِ فسخ ہے۔

امام محمد کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے مگر اُس کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیارِ فسخ ہے۔

ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظِ اخلاق، دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعًا ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔

---

[1] وہ زخم جن کی وجہ سے فرج سے رطوبتیں بہتی رہیں۔

پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ بات اسلامی قانونِ ازدواج کے اصول میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لئے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیارِ فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہنچانے والے ہیں۔ اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لئے خیارِ فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایکدوسرے کے حال کی خبر نہ ہو، اور بعد میں علم ہوتے ہی اس پر ناراضامندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا مگر بعد میں علم ہونے پر انہوں نے خیارِ فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے پاس تو ایک چارۂ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے، یعنی طلاق اور اس کے علاوہ دوسرا چارۂ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا۔ مگر عورت کے لئے بعض صورتوں میں فقہا نے کوئی چارۂ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو فتاویٰ ہیں، ان کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے۔

عِنّین[1] و مجبوب[2] وغیرہ

اگر شوہر مجبوب ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کرانے کا دعوے کرنے کا حق ہے، اور تحقیقِ حال کے بعد فی الفور تفریق کرائی جائے گی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمر رضؓ کے فیصلہ کی بناء پر اسے ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہو تو تفریق کرادی جائے گی۔ لیکن اس کے ساتھ فقہاء نے حسبِ ذیل شرطیں لگائی ہیں۔

(۱) یہ حکم صرف اس صورت میں ہے جب کہ عورت کو پہلے سے اسکے عنین ہونے کا علم نہ ہو۔ لیکن اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا، تو اسے تفریق کے مطالبے کا حق نہیں۔

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کردی تو اس کو مطالبۂ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

(۳) تفریق صرف اس صورت میں کرائی جائے گی جب کہ شوہر ایک مرتبہ بھی مباشرت نہ کر سکا ہو۔ ورنہ اگر اسنے ایک مرتبہ بھی مباشرت کرلی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں

---

[1] نامرد [2] مقطوع الذکر

نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ان شرطوں میں سے کسی کے لئے بھی قرآن اور حدیث میں کوئی سند موجود نہیں ہے۔ اور ہم ان تینوں شرطوں کو درست نہیں سمجھتے۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کیساتھ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر بیّن ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں ایسی نادان عورت کے لئے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر کے تفریق کرا دی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا۔ اور اس نے ابتداءً اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کر دی، تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں جس کی بناء پر اس کو تمام عمر مصیبت کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتداء میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی نیک طبعی کی بناء پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے۔ میں اسی طرح اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی مگر بعد میں اس کو ناقابلِ برداشت تکلیفیں پیش آئیں، جن کا اسے پہلے احساس نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہو گا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جاتے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتداء میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سڑ سڑ کر مر جا یا آبرو

باختہ بن کر زندگی گذار جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہے۔ اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عورت کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں میں منتقل ہوں گے۔ اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا کیا جائے۔ درآں حالیکہ حقیقتہً تفریق میں اس کا بھی کوئی نقصان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی سزا اس غلطی کی اس عورت کو دی جاسکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگرچہ یہ بھی میرے نزدیک زیادتی ہے۔ کیونکہ سزا کا مستحق تو وہ شخص ہے جس نے نامرد ہونے کے باوجود نکاح کیا۔

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقصد ہے وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق کیلئے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لئے ہے اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی ہیں ان کے لئے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ بس ایک یا دو چار مرتبہ شوہر کی صحبت سے متمتع ہو جانا ان کے لئے کافی ہو اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گذار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر کیا ہوگا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگیٔ اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لئے حلال کے دروازے بند کر کے انہیں حرام کے راستوں

پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں نامردی کی ہر شکایت پہ خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوئی ہو عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیے اور اگر کافی علاج کے بعد، جس کے لئے ایک سال کی مدت مناسب ہے یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لئے باطل ہو جائے گا۔ یہاں پھر بے جا شدت پائی جاتی ہے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لئے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرا دینی چاہیئے۔

فقہاء نے خصی کے لئے بھی وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لئے رکھا گیا ہے یعنی اس کو بھی علاج کے لئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور مجبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانثیین، دونوں صورتوں میں وظیفہ زوجیت کے لئے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہذا خصی اور مجبوب کے حق میں ایک ہی قانون ہونا چاہیئے۔

۱۱- جنون

مجنون کے بارے میں حضرت عمرؓ کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی جائے۔ اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جائے۔ فقہاء نے اسی کو لیا ہے اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لئے ہے، جو نکاح سے قبل مجنون تھا اور نکاح کے بعد ہم بستری پر قادر نہ ہوا۔ اس لحاظ سے گویا وہ عنین ہے اور اسی لئے اس کو ایک سال کی مہلت دی جاتی ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں جنون اگر حادث[1] ہو تو اس کو علاج کیلئے ایک سال کی مہلت دی جائے گی، اور اگر مُطبِق[2] ہو تو وہ مجبوب کے حکم میں ہے، بلا تاجیل[3] تفریق کرا دی جائے گی۔

امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مُطبق دونوں میں ایک سال کی مہلت بغرض علاج دی جائے گی اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو، تو تفریق کرا دی جائے گی لیکن اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں۔

(۱) اگر نکاح سے پہلے مجنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح

---

[1] یعنی جس کے دورے کبھی کبھی پڑتے ہوں۔ [2] یعنی دائماً حالت جنون طاری ہے۔

[3] یعنی مہلت دیئے بغیر۔

کیا تو وہ تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا۔

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا مطالبہ کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصریح نہ کی ہو اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت کا موقع نہ دیا ہو۔

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے۔ ان کا کوئی ماخذ کتاب وسنت میں نہیں ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت، تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہو سکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ہو تو اس کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کر دیا جائے۔ اگر نکاح کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کر دیا، لیکن بعد میں اس کے لئے روحانی و جسمانی تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ، رنج تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالتِ جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بناء پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس

کی خبر گیری کی اور سابق کا سا تعلق زن و شوہر اس کے ساتھ رکھنا گوارا کر لیا ، تو اس نے یہ کیوں لازم آ جائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بے چاری کے لئے ناقابلِ برداشت ہو چکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کر دیا جائے ؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشاء یہ ہے کہ جوں ہی کسی عورت کے شوہر میں آثارِ جنون ہویدا ہوں ، وہ فوراً اس کی تمام پچھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کر کے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کر لے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے ، اِس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابلِ برداشت صورت اختیار کر لی تو اس وقت یہ وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہو گی اور اس کا بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا ؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں مرد کے حقوق کا بہت مبالغہ آمیز تصوّر اختیار کیا گیا ہے اور دوسری طرف عورتوں کے ساتھ بڑی سختی کی گئی ہے ۔ عورت اگر بیکار ہو جائے یا جنون میں مبتلا ہو ، یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو ، تو مرد اسے طلاق دے سکتا ہے ، یا دوسری شادی کر کے اپنی زندگی خوش گوار طریقہ سے بسر کر سکتا ہے ۔ لیکن مرد ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت نہ تو اسے طلاق دے سکتی ہے ، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کر سکتی ہے ۔ اس کے لئے بجز تفریق کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے ۔ اب اگر اِس ایک چارۂ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں ، جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لئے رہائی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اُس عدل اور توازن کے خلاف ہو گا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے ۔ ایسے تمام

معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لئے دلیل راہ ہونی چاہیئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیئے۔ عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار[1] اور تعدی[2] نہ ہو اور حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف نہ ہو، لیکن اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیئے۔ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل یا آتشک زدہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجر و اکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لئے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہو سکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت زبردستی اس حالت میں رکھی گئی ہو، اس کے لئے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع زندگی میں پیدا ہو سکتے ہیں اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کیلئے کس قدر دشوار ہے؟

۱۲۔ مفقُود الخبر

مفقود الخبر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سُنَن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وسلم امرأۃ المفقود امرأتہ	حضورؐ نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اُسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کا حال معلوم

---

[1] ایذارسانی، تکلیف دہی [2] زیادتی

حتّٰی یَاتِیَهَا البیَان تہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مُصْعَب اور محمد بن شُرَحْبِیل ہمدانی کے واسطہ سے پہنچی ہے جو مجروح ہیں ابن شرحبیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ مناکیر اباطیل[1] اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شُرَحْبِیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف اور ناقابلِ احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے، وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی۔ کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمد بن شرحبیل اس حدیث کو مُغیرہؓ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیسے ممکن تھا کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمر و عثمان غنی رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق کلیۃً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

---

[1] وہ مغیرہ سے ایسی باتیں روایت کرتا ہے جو منکر اور جھوٹی ہوتی ہیں۔

صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کی آراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زہری، نخعی، عطاء، مکحول اور شعبی کی ہے۔ امام مالکؒ نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اس کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔ سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے۔ انتظار کے لئے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس بستی یا اس کے ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے پھر مختلف بزرگوں نے اپنے اپنے اندازے کے مطابق انسان کی زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے کہ ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود ہو تو اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال، اور بقول بعض ۷۰ سال، اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰ یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ کیوں کہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰ سال ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں اب اگر اس وقت عورت ۲۰ سال کی تھی تو سب سے زیادہ جن بزرگوں نے اس کے ساتھ رعایت فرمائی ہے، ان کے فتوے کے مطابق وہ ۶۰ برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کا انتظار

کرے ۔ پھر اسے نکاح کی اجازت ہے ۔

اس مسئلے میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور یہی اسلامی قانون کی روح اور اس کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے ۔ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ "ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق چھوڑ دو" اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں کرتا ۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی صورت میں کیوں کر پسند کر سکتا ہے ؟ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے ایلاء کرو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو ۔ اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہوگا ۔ یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت سے اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لئے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا سبب بن جائے پھر وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا فرمایا گیا جس کا منشاء صاف طور پر یہ ہے کہ رشتہ ازدواج میں ضرار نہ ہونا چاہیئے ۔ اور ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرار ہے ۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابلِ غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضائقہ نہیں ۔ یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتہ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ

جس عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اس کے لئے حدود اللہ پہ قائم رہنا نہایت مشکل ہے یہ ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق چھوڑنا درست نہیں ہے۔

۱۳۔ مذہب مالکی کے احکام در باب مفقود

علمائے احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلے میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتوے دینا پسند کیا ہے۔ لہذا اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدانِ زوج کی تین صورتیں ہیں اور ہر ایک کے احکام جُدا جُدا ہیں۔

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دے گا۔ بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیارِ خود طلاق دے دے گا، یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر آپ طلاق وارد کر لے[1]۔ شافعی اور حنبلی مذاہب بھی اس مسئلہ میں مالکی مذہب کی

---

[1] تطلیق کیلئے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بَرِیرہ سے فرمایا تھا کہ اَنْتِ اَمْلَکُ بِنَفْسِکِ اِنْ شِئْتِ اَقَمْتِ مَعَ زَوْجِکِ وَاِنْ شِئْتِ

(باقی صفحہ ۱۴۳)

تائید کرتے ہیں، کیوں کہ ان کے نزدیک عدمِ نفقہ بجائے خود تفریق کے لئے کافی ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جوان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لئے معلق رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس کو ایک سال یا چھ مہینے یا جتنی مدت مناسب سمجھے انتظار کرنے کا حکم دے گا۔ اس باب میں حنبلی مذہب بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو جائز رکھا ہے۔ نیز خوفِ معصیت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود مُنہ پھوڑ کر کہہ دے کہ مجھے اِس شوہر کی قیدِ نکاح سے آزاد کر دو ورنہ میں زنا کر دوں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عورت فُقدانِ زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے اور دعوائے کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گذار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے وہ خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لئے اسے مدتِ انتظار میں کس قدر تخفیف کرنی چاہیئے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں ہے اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) فارقیہ، یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے، خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جُدا ہو جائے۔

(الف) اگر مفقود بلادِ اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذّب دنیا کے تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کرنے کا حکم دیا جائے گا۔

(ب) اگر وہ میدانِ جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے بعد ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

(ج) اگر وہ کسی مقامی فساد کے سلسلے میں کھویا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اس کی تلاش کے لئے امکانی کوشش کی جائے گی، پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدّت وفات گذارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

(د) اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھو گیا ہے جن سے مہذّب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان بھی نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مُدّتِ[1] تعمیر گذارنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدّتِ تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے۔ بعض ۷۰ سال کہتے ہیں، بعض ۸۰ سال اور بعض ۷۵ سال۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علمائے احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظرانداز کر جاتے ہیں اور فقدانِ زوج کی تمام صورتوں میں چار سال تک انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے، خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات

---

[1] یعنی ایک اوسط درجہ کے انسان کا جتنی عمر پانا متوقع ہو۔

کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں، ہر فاقد الزوج عورت کے لئے چار سال
کی مدتِ انتظار پر اصرار کرنا مصالحِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی
میں وہ زبردست ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا۔ غیر
اسلامی طریقوں کے رواج نے اُن تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو
شہواتِ نفس کو قابو میں رکھنے کے لئے اسلام نے قائم کی تھیں۔ عریاں تصاویر
ہیں، عشقیہ ناول اور قصے ہیں، ریڈیو کے جنون خیز گانے ہیں جن سے کوئی شخص شہروں
اور قصبوں میں رہتے ہوئے بچ ہی نہیں سکتا۔ اور ان سب پر مزید یہ کہ قانون ملکی
نے زنا کو جائز کر رکھا ہے پھر پردے کے شرعی حدود عملاً باقی نہ رہنے کی وجہ سے
غیر محرم مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے
سامان پیدا کر دیئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے ضبطِ نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی
بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہو گا کہ ایک
جوان عورت جب اپنے مفقود الخبر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد
عاجز آکر عدالت میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم
دے؟ یہ ایسی سختی ہے جس میں صرف عورتوں ہی کے لئے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے
مضر نتائج ساری قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون
میں مفقود الخبر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کیا جائے اور اجراء احکام
میں فاقد الزوج عورت کی عمر، اس کے ماحول اور اُس مدت کا مناسب لحاظ کیا جائے
جس کو حالتِ انتظار میں گذارنے کے بعد اُس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو۔

۱۴- حکم بصورت واپسی مفقود

اس سلسلے میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہرِ مفقود عدالت کی دی ہوئی مدّتِ انتظار ختم ہو جانے کے بعد واپس آجائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر رضہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکاح ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اسی کو ملے گی لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے تو خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو دونوں صورتوں میں شوہرِ اوّل کا اس پر کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے موطّا میں حضرت عمر رضہ کے اس قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہبِ مالکی کا مفتیٰ بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خواہ دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید برآں خلوت ہو چکنے کی صورت میں دوسرے شوہر سے اس عورت کو مہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضہ نے آخر میں حضرت علی رضہ کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام مالک کے نزدیک حضرت عمر رضہ کا رجوع ثابت نہیں ہے۔

حضرت عثمان رضہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو، پھر شوہر اوّل واپس آجائے تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیئے یا مہر؟ اگر اس نے مہر واپس لینے یا معاف کر لینے کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے شوہر سے جدا ہو کر عدتِ طلاق گذارنی ہو گی۔ پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی اور

دوسرے شوہر سے اس کو مہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے، لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہی سب سے بہتر ہے جس سے امام مالک نے استناد کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر عورت کا نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اوّل کا حق اس پر قائم رہے تو کون ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھن جائے بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ برباد ہو؟ اس قسم کی شرائط عائد کرنے میں عورت کے لئے غایت درجے کا ضرر ہے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدت انتظار گذار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے، اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گذارنی پڑے۔

۱۵۔ لعان

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے، دونوں صورتوں میں لعان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپؐ نے فریقین کو مخاطب کر کے تین مرتبہ فرمایا:۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ اَنَّ اَحَدَكُمَا كَاذِبٌ فَهَلْ مِنْكُمَا مِنْ تَائِبٍ۔ اللہ

خوب جانتا ہے، کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ پھر کیا تم میں سے کوئی توبہ کرے گا؟" جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا، تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا گیا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اُس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا۔ ذَاکُمُ التَّفْرِیْقُ بَیْنَ کُلِّ مُتَلَاعِنَیْنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ اِذَا تَفَرَّقَا لَا یَجْتَمِعَانِ اَبَدًا" یہ ہے تفریق کا طریقہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لئے۔ اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔"

شوہر نے عرض کیا کہ جو مال میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب دیا۔ لَا مَالَ لَکَ اِنْ کُنْتَ صَدَقْتَ عَلَیْہَا فَبِمَا اسْتَحْلَلْتَ مِنْ فَرْجِہَا وَاِنْ کُنْتَ کَذَبْتَ عَلَیْہَا فَذَالِکَ اَبْعَدُ لَکَ مِنْہَا" یہ مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اس سے اٹھا چکا ہے اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا۔"

حضورؐ کے اس فیصلہ سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں۔

۱۔ لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہیے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

۲۔ لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی

ایک قصور کا اعتراف کرلے۔ جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں، تب لعان کرایا جائے۔

۳:۔ فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کرے گا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی گئی ہے۔ جمہور کا خیال یہ ہے کہ لعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ کی رائے ہے کہ تفریق کے لئے حکم حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا اعلان فرمایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے محض ملاعنت کو فرقت کے لئے کافی نہیں سمجھا۔

۴۔ لعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو کسی طرح نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون بھی جاری نہیں ہوتا جو حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ لعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کی رائے میں اس پر حدِ قذف جاری کی جائے گی، اور امام ابو حنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لعان کر چکنے کے بعد عورت لعان سے انکار کرے تو شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ اس کو رجم کیا جائیگا،

اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس کو قید کیا جائیگا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے۔ لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کا جرم مستلزم سزا قرار دیا جاسکے، اس لئے سردست ضابطۂ شرعی میں اس کے لئے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اسے مہر سے محروم کر دیا جائے۔ یہ صرف اس وقت تک ہونا چاہیئے جب تک ہم پر ایک غیر مسلم حکومت مسلط ہے اور ہم خود اپنے قوانینِ تعزیرات جاری کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

۱۶۔ تطلیقاتِ ثلثہ در مجلسِ واحد[1]

بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلّظہ کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اُس طریقے کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو

---

[1] ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینا۔

حضورؐ غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنَا بَیْنَ اَظْہُرِکُمْ "کیا اللہ عزوجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟" بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضورؐ نے اس فعل کو معصیت فرمایا اور حضرت عمرؓ کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے والا آتا تو وہ اس کو درّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فعل پر سزا بھی دی جاسکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو جھٹ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں؛ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدِ باب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک تھام کی نکل سکتی ہیں۔ جن کو ہمارے علماء و ماہرینِ قانون غور و خوض کے بعد تجویز کر سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اس مسئلے کو کثرت سے لوگوں میں شائع کرنے

کی ضرورت ہے کہ یہ فعل ناجائز ہے تاکہ جو لوگ ناواقفیت کی وجہ سے اس میں مبتلا ہوتے ہیں وہ آگاہ ہو جائیں۔

خاتمۂ کلام

اس رسالہ میں اسلامی قانونِ ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور کتاب و سنّت کی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اُن مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانانِ ہند کے لیے مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکل صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حلِ مشکلات کے لیے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو لعینہٖ قبول کر لیا جائے۔ انسانی رائے میں بہرحال خطاء اور صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی رائے کے متعلق یہ دعوےٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحیِ خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر ہے کہ قرآن مجید اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانونِ ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابرِ صحابہؓ و ائمۂ مجتہدینؒ نے جو فروع مستنبط کیے ہیں اُن پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں جو ہمارے نزدیک اِس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہلِ علم اور اصحابِ فکر و رائے کا کام ہے کہ وسعتِ نظر اور کتاب و سنّت میں تدبر سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں۔ اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو

محض اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ لکھنے والا بد قسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہُوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسوّداتِ قانون کے متعلق بھی مجملاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلے میں حیدر آباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کیے ہیں[1]۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودات تشنہ اور ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے غیر مکتفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے اُن خرابیوں کو دُور نہیں کیا جا سکتا جو اینگلو محمڈن لا کے نقائص اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریقِ کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی، تو اس سے وہ حکامِ عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو قوانینِ شریعت اور مذاہبِ فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمڈن لا کی سپرٹ مسلط ہے۔ اس بگڑی ہوئی حالت کو درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاص کر ازدواجی معاملات کے لیے ایک مفصّل ضابطہ مدوّن کیا جائے جیسا کہ ہم اس رسالہ کے گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ کام

---

[1] یہاں اُن مسودوں کے محض نفسِ مضمون سے بحث ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ آیا مجالسِ قانون ساز کو بجائے خود کوئی "اسلامی قانون" پاس کرنے کا حق ہے بھی یا نہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے جو قانون یہ پاس کریں، خواہ وہ لفظ بلفظ شریعت کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، بہرحال وہ شرعی قانون نہیں ہو سکتا۔

آسان نہیں ہے، وقت اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں ہے اس کے لیے اصحابِ علم ورائے کی ایک منتخب جماعت کو ایک کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں سے جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ اُمت کے اربابِ حل وعقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانینِ شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک حق ادا ہو جائے۔

ضمیمہ نمبر ا

ایک نہایت اہم استفتاء

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتاء بھیجا ہے جس کا موضوع بجائے خود نہایت اہم ہے ۔ اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں ۔ ذیل میں استفتاء اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے ۔

ماہرین علوم اسلامیہ ومفتیانِ شرع متین سے حسبِ ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب وسنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے ۔

(۱) اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ مسلمان مرد وعورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کر دے ، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دیدے ، جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے تو کیا نکاح فسخ ہو جائے گا ، اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی ، اور عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور ایقاعِ طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو ، دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے ؟

(۲) اگر سوال مذکورۃ الصدر کا جواب نفی میں ہو۔ یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم فسخ نکاح اور ایقاعِ طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور غیر مسلم کے فسخِ نکاح یا ایقاعِ طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اوّل کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے گی، اور اس دوسرے مرد کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے ذریعے سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہوگا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا حرام ہوگا یا نہیں؟ اور دونوں شرعاً زنا کے مرتکب سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

(۳) اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہوگی تو وہ ولدالحرام ہوگی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہوگی یا نہیں؟

مہربانی فرماکر ان سوالوں کے جواب نمبروار مدلل تحریر فرمایئے۔ الخ

اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے، حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں، اس کو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف فسخ و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان معاملات کی نوعیت دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق کے معاملات ہی میں نہیں، بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رُو سے غیر مُسلّم ہے۔ اسلام نہ اُس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک، یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ خود مختارانہ قائم ہوئی ہو، نہ اُس قانون کو تسلیم کرتا ہے جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اُس عدالت کے حقِ سماعت و فصلِ خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرمانروا کے ملک میں اس کی اجازت (Sanction) کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رُو سے اُن عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانوی سلطنت کے حدود میں "تاج" کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔ ان عدالتوں کے جج، ان کے کارندے اور وکیل، اور ان سے فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو بادشاہِ ارض و سما کی مملکت میں اس کے "سلطان" (چارٹر) کے بغیر قائم کیا گیا ہو، اور جس میں اس کے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو۔ ایسا نظامِ عدالت جُرم مجسّم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے معاملات لے جانے والے مجرم ہیں اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے، کیونکہ بغاوت اس کی جڑ میں موجود ہے۔ بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں، تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور اور زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہوں

گے اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پہ کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہوں گی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کیے جو خدا کے قانون کی رُو سے ان کو حاصل نہ تھے۔[1]

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے جبکہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان ان کی کرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لے کر جو شخص مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسان کے بنائے ہوئے قانون کی رُو سے احکام جاری کرتا ہے، وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھلا اس کے احکام کالعدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اُس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جب کہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں، خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں قلیل التعداد ہوں یا

---

[1] اس سلسلے میں اُن مقدمات کی کارروائی مزید بصیرت کی موجب ہوگی جو ۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حکومت ہند نے اُن فوجی افسروں پر چلائے جنہوں نے برما، ملایا پر جاپانی قبضے کے دوران میں "آزاد ہند ریاست" اور آزاد ہند فوج بنالی تھی خصوصیت کے ساتھ شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں کے مقدمہ میں ہندوستان کے ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ کی جو تقریر کی تھی وہ بغور پڑھنے کے لائق ہے۔ کیونکہ اس میں ان نام نہاد "باغیوں" کے مقابلہ میں حکومتِ ہند کی جو قانونی پوزیشن بیان کی گئی تھی، درحقیقت وہی تمام اصلی و حقیقی باغیوں کے مقابلہ میں سلطنت رب العالمین کی قانونی پوزیشن ہے۔ (یہ حاشیہ بعد میں اضافہ کیا گیا ہے)

کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری لادینی اصول پر نظام حکومت قائم کیا ہو۔ بہر حال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر ہو کہ اہل ملک خود مالک الملک (Sovereign) ہیں اور ان کو قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے قانون بنانے کا اختیار حاصل ہے، اس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے اور اس کے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کر لے۔ جس طرح ایسی حکومت کو اُس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کر سکتا اُسی طرح اِس نوعیت کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہوں گی، خواہ ان کے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، ان کے فیصلے بھی اسی طرح کالعدم ہوں گے، جس طرح کہ صورتِ اول و دوم میں بیان کیے گئے ہیں۔

جو کچھ عرض کیا گیا اس کی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم چونکہ سائل نے کتاب و سنّت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے محض چند آیاتِ قرآنی یہاں پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) قرآن کی رُو سے اللہ تعالےٰ مالک الملک ہے۔ خلق اسی کی ہے۔ لہٰذا فطرۃً امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے[1]۔

---

[1] اِلّا یہ کہ کوئی اس کے خلیفہ و نائب کی حیثیت اختیار کر کے اُس کے قانونِ شرعی کے مطابق حکمرانی اور فیصلہ کرے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ (آل عمران۔ ۲۶)	کہو اے اللہ، مالک الملک، تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر۔ ۱۳)	وہ ہے (اللہ) تمہارا رب، ملک اُسی کا ہے۔
لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (بنی اسرائیل۔ ۱۱۱)	بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں (Partner) ہے۔
فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (المومن۔ ۱۲)	لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کے لیے خاص ہے۔
وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (الکہف۔ ۲۶)	اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصہ دار نہیں بناتا۔
اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔ (اعراف۔ ۵۴)	خبردار خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔
يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ (آل عمران۔ ۱۵۴)	لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ امر سارا کا سارا اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

(۲) اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکلیہ سلب کر لیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، بندہ اور محکوم ہے اور اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے اس کے لیے بنایا ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۱۶۲ پر)

قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے، یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ طاغوت ہے، باغی اور خارج از اطاعت حق ہے۔ اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلے پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ۔

(النحل - ۱۱۶)

اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے (Lawful) اور یہ حرام (Un-lawful)

اِتَّبِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِیَآءَ

(اعراف - ۳)

جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھیرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔

---

[1] قانونِ الٰہی کی حدود کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے جو یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں روحِ شریعت اور مزاجِ اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے کیونکہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنے کا قانونی حق اہلِ ایمان کو دے دیا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المائدہ ۔۴۴)	اور جو اُس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ۔ (النساء ۔۶۰)	اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اُس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)

(۳) خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور صحیح عدالت صرف وہ ہے جو اُس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اسی کا نام خلافت ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۔۶۴)	اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔
اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ (النساء ۔۱۰۵)	اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اُس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ...... اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ

(المائدہ ۵ - ۴۹-۵۰)

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اُس ہدایت کے کسی جُز سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے ..... کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(ص-۲۶)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا ہے لہٰذا تم حق کیساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ ورنہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکا لے جائے گی۔

(۴) اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوندِ عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو، بلا لحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں کتنی ہی مختلف ہوں، ان کے تمام افعال بے اصل اور باطل ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ کے لیے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان Charter عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں، خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم

[1] باغیانہ سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپ کو رعایا (باقی صفحہ ۱۶۵ پر)

ہے۔ اہل ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) ان کے وجود کو بطور ایک خارجی واقعہ[1] کے تسلیم کر سکتے ہیں، مگر بطور ایک جائز وسیلۂ انتظام و فصلِ قضایا کے[2] تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا ــــ اللہ ــــ کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے اور جو ایسا کریں وہ ادعائے اسلام و ایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ سے خارج ہیں یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت ایک گروہ کو باغی قرار دے اور پھر اپنی رعایا پہ اُن باغیوں کے اقتدار کو جائز بھی تسلیم کرے، اور اپنی رعایا کو ان کا حکم ماننے کی اجازت دیدے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکہف-۱۰۵)

(بقیہ حاشیہ ص۱۶۴) اس کا خلیفہ (نہ کہ خود مختار) تسلیم کرے، پیغمبر کو اس کا پیغمبر اور کتاب کو اس کی کتاب مانے، اور شریعتِ الٰہی کے تحت رہ کر کام کرنا قبول کرے، صرف ایسی ہی حکومت اور عدالت کو خداوند عالم کا چارٹر حاصل ہے۔ یہ چارٹر خود قرآن میں دے دیا گیا ہے کہ اَحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (لوگوں کے درمیان حکومت کر اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے)

[1] Defacto [2] Dejure

(اے نبی!) ان سے کہو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود، رضائے الٰہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی) اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی ملاقات (اس کے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اس لئے ان کے سب اعمال حبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ۔ (ہود۔۵۹)

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمن حق کے امر کا اتباع کیا۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِينٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَاتَّبَعُوا أَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ۔ (ہود۔۹۶-۹۷)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح روشن سلطان کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے ہمارے فرستادہ شخص کے بجائے فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا۔)

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ

اور تو کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کر جس کے دل کو

ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ أَمْرُهٗ فُرُطًا

(الکہف-۲۸)

ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اس کے رب ہیں) غافل کر دیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جسکا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا

(اعراف-۳۳)

اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاموں کو خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو، اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت) یا الوہیت میں ان کو شریک کرو جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔

وَمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهٖٓ إِلَّآ أَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوهَآ أَنْتُمْ وَآبَآؤُكُمْ مَّآ أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ۔ (یوسف-۴۰)

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو وہ تو محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لئے خاص ہے اسکا فرمان ہے کہ اسکے سوا کسی کی بندگی نہ کرو

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ

اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے درآنحالیکہ راہ راست اس پر واضح ہو گئی اور ایمان والوں کا رستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود مڑ گیا اور

وَسَاءَتْ مَصِيْرًا۔ (النساء۔۱۱۵)

اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ (النساء۔۶۵)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی تجھ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء۔۶۱)

اور جب کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف تو تو نے منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے چھڑک رہے ہیں۔

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا۔ (النساء۔۱۴۱)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کیلئے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے اسلام کے نظام اخلاق اور نظام تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر مشتبہ رہ جاتا تو قرآن کا نزول ہی معاذاللہ بیکار ہوتا۔ اس لئے قرآن نے اس کو اتنے صاف اور قطعی طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔

پھر جب کہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لئے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے۔ اور اللہ کے سلطان

سے بے نیاز ہوکر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اس کی قانونی حیثیت سر اسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملہ میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچے کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اس کے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بال بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ خنزیر جب پورا کا پورا حرام ہے تو اس کی کسی بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں پس یہ سوال کرنا کہ فسخِ نکاح، اور تفریق بین الزوجین، اور ایقاعِ طلاق کے بارے میں غیر الٰہی عدالتوں کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظامِ عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں، اُن کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہو گا، حالانکہ خنزیر کے جسم کی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لئے اسلام کے اوّلین بنیادی اصول میں ترمیم تو نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصولِ اسلام میں ترمیم کرنے یا بالفاظِ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں اس سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام

کو چھوڑ کر کسی آسان طریقِ زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو اُن کے لئے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ اُن کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری قوت صرف کریں۔

(ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۴۰ء)

ضمیمہ نمبر ۲

یورپ کے قوانینِ طلاق و تفریق

(تُعرفُ الأشیاءُ باضدادِها)[1] اسلامی قانونِ ازدواج کی جو تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں ان کو دیکھ کر پوری طرح اس قانون کی شانِ کمال کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے مقابلہ میں دنیا کے اُن قوانین کا مطالعہ نہ کیا جائے جن کے متعلق ترقی یافتہ قوانین ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اِس مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اللہ تعالےٰ کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر انسان جب خود اپنا قانون ساز بنتا ہے تو کس قدر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی احکام میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کا ایک بلند ترین نصب العین پیشِ نظر رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی و اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف افراد کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ ایک طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتا جن کا کسی وقت عالمِ واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا

---

[1] چیزیں اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں۔

کوئی قاعدہ اور کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ان سب کا اسلام میں، نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے، اور ان کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف زمانوں میں، مختلف تمدنی حالات اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے اور کہیں کسی شخصی یا اجتماعی تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعیِ بلیغ، اس کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس کے لگ بھگ بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الٰہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ انسان اپنے لازمی تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال و مستقبل پر یکساں نظر رکھے، بالفعل اور بالقوۃ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل و مناسبت کیساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا، کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے، کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے، کہیں اشخاص کے حقوق

اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں فرد اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے، غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلتے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا قوانین میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الٰہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان یہ بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شپرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ چڑھ کر حملے کئے جاتے تھے۔ اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی ناقابلِ انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا، وہی صحیح تھا۔ اُس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے، وہ سب غلط اور ناقابلِ اتباع نکلے۔ اگرچہ عالمِ تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے اور زبانیں اب بھی ان کی ناکامی کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دنیا ان قوانین کو توڑ رہی ہے جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور ناقابلِ ترمیم سمجھتی تھی، اور آہستہ آہستہ ان اصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کئے تھے، لیکن بعد از خرابیٔ بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلے کو لے لیجئے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی، اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جواب بن نہ آتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازدواج

کے مقدس رشتے کو ناقابل انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع و فسخ و تفریق کی
گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا
نتیجہ تھا اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظامِ تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے
اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ :-

"جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جُدا نہ کرے" (متی ۱۹ : ۶)

مگر مسیحیوں نے نبی کے اِس قول کا منشا نہ سمجھا اور اسے اخلاقی ہدایت کے بجائے
قانونِ ازدواج کی اساس بنالیا۔ انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابلِ عمل
قانون کے خلاف حیلوں اور مکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی۔ پھر خلاف ورزی
قانون کی عادت بڑھنے اِتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتۂ ازدواج سے زیادہ مقدس
تھیں ان کو بھی بکثرت اور عَلانیہ توڑا جانے لگا۔ آخر کار انسانوں نے مجبور ہو کر اُس
قانون میں چند جزوی اور ناقص ترمیمیں کیں۔ جسے غلطی سے وہ خدا کا قانون سمجھ رہے
تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اس وقت اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروانِ
مسیح کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی کسی چیز کا بھی احترام باقی نہ چھوڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں کی بدولت مسیحی دنیا میں طلاق اور فسخ و
تفریق کا ایک طوفان اُمڈ آیا، جس کی شدت سے خاندانی نظام کی "مقدس" دیواریں
پاش پاش ہوتی چلی جارہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۷۱ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی
تھیں، وہاں ۱۹۳۳ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے
ہر ۹۷ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جدا کر دیا۔ امریکہ جہاں ۱۸۸۶ء میں ۲۵ ہزار

تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۴۳ ہزار مقدس رشتے قطع کر لئے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ۱۵ شادیوں میں سے ایک کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اسی سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ۔ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ [۱] (البقرہ۔ ۲۷)

مسیح نے یہودیوں کی "سخت دلی" اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لئے کہا تھا کہ:۔

"جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسرا بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے۔" (متی ۱۹: ۹)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی غرض کے لئے اس سے زیادہ جچے تلے الفاظ میں طلاق کو اَبْغَضُ الْمُبَاحات فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھیرایا۔

مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص کی تعلیم کے لئے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انہی کو بجنسہ لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلّمِ اخلاق ہی نہ تھے، بلکہ صاحبِ شریعت بھی تھے۔ اس لئے آپ نے اصولِ اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں

---

[۱] جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان تعلقات کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، یقیناً وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصولِ اخلاق و مقتضیاتِ فطرتِ انسانی کے درمیان کس طرح توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحبِ شریعت نہ تھے بلکہ اجرائے شریعت کی نوبت آنے سے پہلے ہی دنیا میں اُن کی نبوت کا مشن ختم ہو گیا تھا اس لئے ان کے ارشادات میں اخلاق کے ابتدائی اصولوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ زندگی کے عملی مسائل پر اُن اصولوں کا صحیح انطباق اگر ہو سکتا تھا تو موسوی شریعت کی روشنی ہی میں ہو سکتا تھا۔ مگر مسیحی یہ سمجھے اور سینٹ پال نے اُن کو یہ سمجھایا کہ اصولوں کو پا لینے کے بعد اب ہم الٰہی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ "چرچ" کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر خود قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لئے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصولِ دین بتائے تھے، ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قومیں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو بُرائی کی تھی، اس میں "حرام کاری" کا استثنا کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مُطلقاً بُری چیز نہیں بلکہ سببِ جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اسے اوپر والی آیت "جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جُدا نہ کرے" سے متعارض سمجھ کر بعض نے

۱؎ جائز کاموں میں سب سے زیادہ بُرا کام

تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق تو کرا دی جائے مگر رشتہ نکاح بدستور قائم رہے " یعنی دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی۔ منجملہ دوسرے قوانین کے یہ قانون بھی مسیحی قوموں کے اندر بد اخلاقی کے رواج کا بہت کچھ ذمہ دار ہے۔

لطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادعا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial Separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جاتے مگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔ کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Cannon Law) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتہ نکاح کا کامل انقطاع، جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو قطعاً ممنوع تھا۔ البتہ تفریق کے لئے چند صورتیں تجویز کی گئی تھیں۔

(۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری (۲) نامردی (۳) ظالمانہ برتاؤ (۴) کفر (۵) ارتداد (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارۂ کار تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ زوجین ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کریں۔ کون صاحب عقل اس چارۂ کار کو مطابق عقل کہہ سکتا ہے؟ دراصل یہ کوئی قانونی چارۂ کار نہ تھا۔ بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے الگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لیجاتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ اور اگر کسی قضا کے مارے ہوئے جوڑے کی تفریق ہوجاتی تھی، تو اسے الحاد راہبوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لئے مسیحی علماء نے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر "چرچ" کا قانون ایسے بدنصیب زوجین کا نکاح فسخ کر دیتا تھا۔ منجملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے، کہ زوجین نے مدت العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا، وہ بلا ارادہ ان سے سرزد ہو گیا تھا، ورنہ دراصل ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لئے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا تھا (یعنی متعہ) تو اس صورت میں مذہبی عدالت فسخِ نکاح، یا بالفاظِ صحیح تر بطلانِ نکاح Nullity کا اعلان کر دے گی۔ مگر مسیحی قانون کی رُو سے "بطلان نکاح" کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارۂ کار پہلے سے بھی ذلیل تر تھا۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church) نے، جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں، نسبتاً ایک بہتر اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بندِ نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زنا اور اس کے مقدمات (۲) ارتداد (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قسیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لئے وقف کرنا (۴) لغاوت (۵) نشوز (۶) نامردی (۷) جنون (۸) برص وجذام (۹) طویل مدت کے لئے قید ہونا (۱۰) نفرت باہمی یا شدید

ناموافقت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے نزد کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتہ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لئے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رائل کمیشن کے سامنے بشپ گور (Bishop Gore) نے مشرقی کلیسا کی فقہ سے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا مقلد ہے۔ ۱۹۳۰ء کی لیمبتھ کانفرنس (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح نہیں پڑھ سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ موجود ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراض خبیثہ میں مبتلا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اس نے شوہر سے اپنے حمل کو مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آئے تو نہ عورت کے لئے مذہبی حیثیت سے کوئی چارۂ کار ہے نہ مرد کے لیے۔

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے علماء اور فقہا پیدا ہوئے مگر ابتدا میں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہو گئی تھی اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ امتداد زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقا، انسانی فطرت کا مطالعہ

سینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے، اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں اور ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقشے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر اُن روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجئے جنہوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لئے خود اپنے علم کے بل بوتے پر ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزادیٔ تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اُس قانون کے نقائص کو محسوس کیا، اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کیے جا سکتے۔ سرے سے اس کا جُوا ہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا (۱۷۹۲ء)۔ اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ وغیرہ نے بھی مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لئے جن میں قانونی تفریق اور فسخ کے علاوہ طلاق کے لئے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہ راست نتیجہ ہے اُس تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علماء ایک ناقابل عمل خلاف

فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مسلط رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا۔ لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابلِ ترمیم قرار دیا۔ انہوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلافِ عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا محض اس لئے کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے حتیٰ کہ انہوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے بلکہ صرف اس بنا پر کہ "ہم مغربی چرچ کے مقلد ہیں"۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرزِ عمل نے مغربی قوموں کے لئے بجز اس کے کوئی چارۂ کار باقی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابلِ اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانونِ ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے، دراصل یہی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لامذہبی کی طرف دھکیل کر لے گئی ہے۔

مذہبی قانون سے آزاد ہو جانے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جو ازدواجی قوانین وضع کئے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگرچہ سینکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور تجربات کی روشنی میں پے در پے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک امی علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو اُن تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انہیں رومن چرچ کے ابتدائی باتوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ، دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لئے آزاد ہوں، اُس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورہ بالا دو وجوہ کے ساتھ ایلاء (یا انقطاع تعلق زن و شو) (Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا، بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ مدت تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدہ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مرد عدالت سے رجوع کرے، بطور خود وہ طلاق نہیں دے سکتا۔ اور اسی طرح عورت کے لیے بھی لازم کیا گیا کہ اگر وہ طلاق لینا چاہے تو گھر کے گھر ہی میں مرد سے معاملہ طے نہیں کر سکتی، بلکہ بہر حال میں اسے بھی عدالت سے ہی رجوع کرنا ہوگا۔ پھر عدالت کے لئے طلاق کی ڈگری دینے کی صرف ایک ہی صورت رکھی گئی، اور وہ یہ کہ اگر مرد طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکب زنا ہونا ثابت کرے اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاب زنا اور اس کے ساتھ ہی ظالمانہ برتاؤ یا نشوز کا بھی ثبوت دے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہر حال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دے کر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغدار بنا دینا

ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا۔ عدالتوں کو سوسائٹی کے تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالت ہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بداخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید برآں اس قانون نے شوہروں کو دیّوثی کی بھی تعلیم دی، کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے۔ ہرجانہ! یعنی بیوی کی عصمت کا معاوضہ!! تمتّعِ ناجائز کی قیمت، جو قرمساقوں کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!!!

۱۸۶۶ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح توڑنے کے ساتھ ساتھ خطاکار شوہر پر مطلّقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے۔ ۱۹۰۷ء کے قانون میں شوہر کے خطاکار ہونے کی شرط اڑا دی گئی اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلّقہ عورت کے نفقہ کی ذمّہ داری ڈال دے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا، درآنحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبنی بر انصاف کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے، اور اس سے الگ رہے، تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی، اور اسے نفقہ دلوائے گی، اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے بُرے برتاؤ یا تغافل کے سبب سے زنا کی مرتکب ہو تو اس کے خلاف طلاق

کے لیے شوہر کا دعویٰ قابلِ سماعت نہ ہوگا۔ ذرا اس کے معنی پر غور کیجئے۔ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا رہی ہے، شوہر کو پاس نہ پھٹکنے دے۔ اخراج کے لیے روپیہ اس سے لے اور زندگی کا لطف دوستوں سے اٹھائے، پھر اگر شوہر ایسی عورت سے پیچھا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانونِ ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے در پے محنتوں سے مرتب کیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے تین سال کی محنت کے بعد سنہ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ اسبابِ طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے، یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسبِ ذیل اضافہ تجویز کیا گیا:۔

تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابلِ علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گزر چکے ہوں۔ شرابی پن کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید

---

[1] شرابی پن کے معنی مغربی اصطلاح میں عادۃً شراب پینے کے نہیں ہیں بلکہ حد سے زیادہ شراب پی کر عربدہ کرنے اور ادھم مچانے اور ڈربیٹ، گالم گلوج اور بر سرِ بازار بیہودگیاں کرنے کے ہیں۔

کی سزا جو سزائے موت سے معاف کر کے دی گئی ہو۔

(۳) شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لئے زوجین میں تفریق کرائی جائے اور اگر اس مدت میں یہ لت نہ چھوٹے تو ضرر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراضِ خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور وہ دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو فسخ نکاح کے لئے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدماتِ طلاق کی رپورٹیں دورانِ مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت، روداد کے جن حصّوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

اِن تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو، جو سب سے زیادہ نامعقول تھی، قبول کر کے ۱۹۲۳ء کے قانونِ معاملاتِ ازدواج (Matrimonial Cases Act) میں شائع کیا گیا۔ باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی ہے کیونکہ کنٹربری کے اُسقفِ اعظم اور بعض دوسرے بااثر لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقّہ کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکابِ زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں کی اتنی کثرت ہو گئی کہ انگلستان کی عدالتیں اُن سے پریشان ہو گئیں اور ۱۹۲۸ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivalle) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے، وہاں اب تک رشتۂ

نکاح ناقابلِ انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہو سکتی ہے جس کے بعد زوجین نہ مل سکتے ہیں نہ آزاد ہو کر نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین اِسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانونِ ازدواج نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napolian) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۸۶ء، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۲۴ء میں اس کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لئے حسبِ ذیل وجوہ قرار دیئے گئے ہیں۔

زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، اَحدُالزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے اس کے ساتھی کی عزت پر حرف آئے، حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب نوشی کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجبِ ذلت ہو۔

علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کیلئے تین سو دن کی عدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے [1]۔

---

[1] عدت کی اصل غرض یہ ہے کہ ایک مرد سے الگ ہونے کے بعد اور دوسرے مرد کی زوجیت میں جانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیا جائے کہ عورت حاملہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے بالکل فطری صورت اختیار کی ہے کہ تین مرتبہ حیض آنے سے اس امر کا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ یہ وضع حمل طلاق کے دس دن بعد ہو جائے اس کے مقابلہ میں ۳ سو دن یا ۱۰ مہینے کی عدت کے لئے کوئی فطری بنیاد نہیں ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ مگر ناقص اور غیر معتدل ہونے میں سب متفق ہیں۔

آسٹریلیا، بلجیم، سوئٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین صرف باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کر سکتے ہیں یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔

جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلق ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں تاوقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ یہ قانون ایلاء کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں اس کے لئے تین سال کی مدت ہے اور ہالینڈ میں پانچ سال کی دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔

مفقود الخبر کے لئے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے ممالک کے قوانین مفقود الخبر کے باب میں خاموش ہیں۔

مجنون کے لئے جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے۔ باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

بلجیم میں مطلقہ کے لئے دس مہینے کی عدت ہے۔ فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کی مدت مقرر نہیں کی گئی۔

آسٹریلیا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوائے طلاق کے لئے کافی ہے۔ بلجیم میں محض سزا پانا ہی عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حقدار بنا دیتا ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لئے حبس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر

ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی ان کے مقابلہ میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عدل، توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سدِ باب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت اور ازدواجی زندگی کے تمام مسائل و معاملات پر جامعیت کے ساتھ حاوی ہونے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہوا ہے اُس کا عُشر عشیر بھی مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلاء نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اُس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی جماعتِ ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعوٰی کرنا چاہیے تھا مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بیّن ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

پھر اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کے باوجود اگر انسان اپنی زندگی کے معاملات میں ہدایتِ الٰہی کی ضرورت سے انکار کئے چلا جاتے اور اپنا ہادی و شارع خود ہی بننے

پر اصرار کرتا رہے۔ تو بجز اس کے کہ اس کی اس ضد کو حماقت کہا جائے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس شخص سے بڑھ کر احمق کون ہوگا جس کو ایک بے غرض اور خیر خواہ رہنما سیدھا راستہ بتانے کے لئے موجود ہو۔ مگر وہ کہے کہ میں تو خود ہی راستہ تلاش کروں گا، اور اس تلاش میں خواہ مخواہ مختلف راستوں پر بھٹکتا پھرے۔

(ترجمان القرآن۔ جون، جولائی، اگست ۱۹۴۱ء)

مطبوعات

ادارۂ ترجمان القرآن

- تفہیم القرآن
- پارۂ اوّل (تفہیم القرآن)
- سُورۃ النُّور ” ”
- سُورۃ لقمان ” ”
- سُورۃ الاحزاب ” ”
- سُورۃ یٰسٓ ” ”
- سُورۃ الفتح ” ”
- سُورۃ الحجرات ” ”
- سُورۃ الرحمٰن ” ”
- تیسواں پارہ ” ”

- خطبات حصہ اوّل (حقیقتِ اسلا
- خطبات حصہ دوم (حقیقتِ صوم و
- خطبات حصہ سوم (حقیقتِ زکوٰۃ
- خطبات حصہ چہارم (حقیقتِ ح
- خطبات حصہ پنجم (حقیقتِ
- الجہاد فی الاسلام
- حقوق الزوجین
- خلافت و ملوکیت
- سلاجقہ
- دکن کی سیاسی تاریخ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ - لاہور

مطبوعات

ادارہ ترجمان القرآن

- تفہیم القرآن
- پارہ اول (تفہیم القرآن)
- سورۃ النور " "
- سورۃ لقمان " "
- سورۃ الاحزاب " "
- سورۃ یٰسٓ " "
- سورۃ الفتح " "
- سورۃ الحجرات " "
- سورۃ الرحمٰن " "
- تیسواں پارہ " "

- خطبات حصہ اول (حقیقت اسلا
- خطبات حصہ دوم (حقیقت صوم و
- خطبات حصہ سوم (حقیقت زکوٰۃ
- خطبات حصہ چہارم (حقیقت ح
- خطبات حصہ پنجم (حقیقت
- الجہاد فی الاسلام
- حقوق الزوجین
- خلافت و ملوکیت
- سلاجقہ
- دکن کی سیاسی تاریخ

ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور